عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں سماجی طنز کا مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

آمنہ حفیظ

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

اپریل، 2020ء

عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں سماجی طنز کا مطالعہ

مقالہ نگار:

آمنہ حفیظ

یہ مقالہ

ایم۔فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگوئجز

(اُردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

اپریل، 2020ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگوئجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں سماجی طنز کا مطالعہ

پیش کار: آمنہ حفیظ رجسٹریشن نمبر: 1253/M/U/F16

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبۂ اردو زبان و ادب

ڈاکٹر نعیم مظہر _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر ارشد محمود _____

ڈین فیکلٹی آف لینگوئجز

بریگیڈیئر محمد ابراہیم _____

ڈائریکٹر جنرل

تاریخ: _____

اقرار نامہ

میں آمنہ حفیظ حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد کے ایم۔فل اردو اسکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر نعیم مظہر کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گی۔

_____

آمنہ حفیظ

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم	III
اقرار نامہ	IV
فہرست ابواب	V
Abstract	VIII
اظہارِ تشکر	X
باب اول: سفر نامہ سماجی طنز: بنیادی مباحث	۱
الف: تمہید	۱
i۔ موضوع کا تعارف	۱
ii۔ بیان مسئلہ	۱
iii۔ مقاصد تحقیق	۲
iv۔ تحقیقی سوالات	۲
v۔ نظری دائرہ کار	۳
vi۔ تحقیق کی اہمیت	۳
vii۔ تحقیقی طریقہ کار	۳
viii۔ مجوزہ موضوع ماقبل تحقیق	۴
ix۔ تحدید	۴
x۔ پس منظری مطالعہ	۵
ب: سفر نامہ اور اس کا فن	۵
ج: سماجی طنز	13
i۔ طنز و مزاح میں فرق	۱۶
ii۔ طنز و مزاح کے عناصر	۱۷

۱۔ کم بیانی، رمز ۱۸

۲۔ ہجو 18

۳۔ پھبتی، استہزا، تمسخر، طعن 19

۴۔ دشنام، گالی گلوچ 19

۵۔ فینٹیسی ۲۰

۶۔ علامت 20

۷۔ تحریف 21

۸۔ موازنہ و تضاد ۲۲

۹۔ ایہام۔ رعایت لفظی، ضلع جگت 22

۱۰۔ برجستگی بذلہ سنجی ۲۳

۱۱۔ ظرافت 23

۱۲۔ صورتِ واقعہ 23

د: سماج اور ادب ۲۴

۔ حوالہ جات 35

باب دوم: عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں سماجی طنز کا فکری پہلو 38

الف: سماجی صورتحال پر طنز 42

ب: سیاسی صورتحال پر طنز 55

ج: معاشی صورتحال پر طنز 67

د: اخلاقی صورتحال پر طنز 75

۔ حوالہ جات 92

باب سوم: عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں سماجی طنز کا فنی پہلو 96

الف: طنز کے مختلف طریقے / تکنیک 96

ب: طنز کا لسانی پہلو 111

ج: طنز کا مجموعی اسلوب 115
۔ حوالہ جات 125

باب چہارم: عطاء الحق قاسمی کا ہم عصر سفر نامہ نگاروں کے ساتھ سماجی طنز کے تناظر میں تقابل 127
الف: عطاء الحق قاسمی بطور سماجی طنز نگار 127
ب: مستنصر حسین تارڑ 143
ج: جمیل الدین عالی 157
۔ حوالہ جات 165

باب پنجم: ماحصل 167
الف: مجموعی جائزہ 167
ب: نتائج 175
ج: سفارشات 176
۔ کتابیات 177

Abstract

Title:

Study of social satire in the travelogues of Ata-ul-Haq-Qasmi

Abstract:

Ata-ul-Haq Qasmi is a well-known and praiseworthy columnist, sketch writer and travelogue writer. This research paper deals with social satire in the travelogues of Ata-ul-Haq Qasmi. Social satire is sunch an instrument in literature as points out a flaw, it ermarks some hidden behaviour but the purpose of such satire is not abhor or degrade any one, rather an effort is made to reform the society with its help so that some help should be provided to remove the flaws found in social and cultural values. This research takes into focus four travelogues of Ata-ul-Haq Qasmi, 1. “Shoq-e-Awargee” 2. “Duniya Khoobsoorat Hai” 3. “Goron Key Daise Main” and “Dilli Door Ast”.

In the travelogue of Ata-ul-Haq Qasmi we find countless examples of satire on political, social, economic and moral aspects and levels.

He can be observed using all the techniques of satire in his travelogues. While doing this research, documented historical method has been adopted and for this purpose, help has been sought from other literary books, magazines and journals and different libraries. The importance of this thesis enhance by virtue of the quality that we find social and cultural reflection of two civilization in it, moreover in he ravelogues of Atal-ul-Haq Qasmi, we find reflection of common traditions, language, externally visible social behaviours, habits and ways of day to day life of two civilizations. By doing so, different shades of social sative have been utilized by them. In these travelogues the attractive colores of

his travel are found alongwith the elements of stive and human evidently. His travelogues are not only different and peculiar from the prespective of his style of writing, but from the perspective of thought, novelty and newness.

Atal-ul-Haq Qasmi has played an import role in presenting a clear picture of the present popular society through his travelogues. The object of my thesis is to bring to the fore the aspects and shades of social satire of his travelogue writing.

اظہارِ تشکر

سب سے پہلے میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کروں گی۔ مقالہ کی تکمیل کے دوران مجھے بہت سی مشکلات پیش آئیں لیکن ان میں متعدد شخصیات ہیں جنھوں نے میری رہنمائی کی۔ مجھے متعلقہ مواد کی نشاندہی کی، ایسی شخصیات بے حد شکریہ کے مستحق ہیں۔

مقالے کی تکمیل ڈاکٹر نعیم مظہر کی زیرِ نگرانی عمل میں آئی۔ جنھوں نے قدم قدم پر میری حوصلہ افزائی کی۔ موضوع کے انتخاب سے لے کر مقالے کی تکمیل تک مجھے ان کا تعاون حاصل رہا جن کی میں بے حد شکر گزار ہوں۔ دورانِ تحقیق میرے والدِ محترم پروفیسر محمد حفیظ کی متشکر ہوں جنھوں نے نہایت مشفقانہ انداز سے مشورے دیے اور اپنے استاد محترم ڈاکٹر ذوالفقار علی احسن کی متشکر ہوں۔ میں نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز کے شعبہ اردو کے قابل اساتذہ کرام کا ذکر کرنا ضروری سمجھتی ہوں جن کی رہنمائی، معاونت اور محبت و شفقت نہ ہوتی تو میں آج تحقیق کا مرحلہ مکمل نہ کر سکتی اس لیے میں پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ اسلم، ڈاکٹر رخشندہ مراد، صدر شعبہ اردو پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شہناز کا بھی دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتی ہوں جن کی رہنمائی سے آج یہ تحقیق کا مرحلہ پایہ تکمیل تک پہنچا۔

والدہ محترمہ کی دعائیں نیک تمنائیں ہمیشہ میرے ساتھ رہی ہیں۔ اللہ پاک ان کا سایہ ہم پر ہمیشہ قائم رکھے۔ ان کو صحت و تندرستی والی زندگی دے۔ اس کے علاوہ میں اپنی چھوٹی بہن کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جس نے میرے مطالعہ کرنے کی مصروفیات کا خیال رکھا۔ اپنے چھوٹے بھائی کی بھی ممنون ہوں جس نے ترسیل مواد میں میری مدد کی۔ میں اپنی تمام ہم جماعت اور دوستوں کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے تحقیق کے اس مشکل مرحلے میں میری مدد کی۔

آمنہ حفیظ

باب اول:

سفر نامہ سماجی طنز: بنیادی مباحث

الف: تمہید

i. موضوع کا تعارف

عطاء الحق قاسمی نے ادب کی مختلف اصناف میں اپنی خلاقی کے جوہر دکھائے ہیں وہ بیک وقت ڈراما نگار، کالم نگار، خاکہ، شاعر اور سفر نامہ نگار کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔ موجودہ تحقیقی مقالہ عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں سماجی طنز کے حوالے سے ہے۔ عطاء الحق قاسمی بنیادی طور پر مزاح نگار ہیں اوراس اسلوب کو انہوں نے مختلف اصناف میں خوش سلیقگی سے بر تا ہے۔ ان کے سفر ناموں میں ان کے اسلوب کی سب سے نمایاں اور بڑی خوبی ان کا طنز و مزاح ہی ہے۔ عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں موضوعات کی رنگا رنگی ہے۔ ان کے ہاں موضوع، تکنیک اور اسلوب کے اعتبار سے انفرادیت پائی جاتی ہے۔ ان کے سفر ناموں میں یورپی تہذیب کا اپنی تہذیب و معاشرت سے موازنہ کا انداز بھی ان کے ہاں نظر آتا ہے اور یہ موقع وہ کبھی بھی ہاتھ سے نہیں گنواتے اور دو مختلف تہذیبوں کے تحت زندہ رہنے والوں کی طرزِ معاشرت کو پیش کرتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں ان تمام خصوصیات کے ہونے کی وجہ سے ان کے سفر ناموں کا اس حوالے سے جائزہ لیا گیا جو کہ نہایت دلچسپ اور بصیرت افروز ہے۔

ii. بیان مسئلہ

ادب اور سماج کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ عطاء الحق قاسمی سفر ناموں میں سماجی طنز کا تذکرہ زیادہ ملتا ہے۔ جدید سفر نامہ قدیم سفر ناموں کی مانند سفری تجربات اور صعبتوں کے بیان سے معمور نہیں بلکہ موجودہ سفر ناموں میں عوامی روایات، زبان، بیرونی سماجی رویوں اور عادات و اطوار، رہن سہن موسمی حالات کے ساتھ ساتھ دو

تہذیبوں کی فکر و فن کا مطالعہ ہے۔ بیرونی، سماجی رویوں اور عادات و اطوار میں سماجی اور ثقافتی طور پر دونوں تہذیبوں مشرقی تہذیب اور مغربی تہذیب کا فرق ہمیں زمانہ جدید کے سفر ناموں میں ملتا ہے کیونکہ عطاء الحق قاسمی نے اپنے اسفار میں ان تہذیبوں کا قریبی مشاہدہ کیا ہے اور اپنے سفر ناموں کی زینت بنایا۔ سماجی طنز عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں دیگر معاصر سفر نامہ نگاروں کی نسبت زیادہ ملتا ہے۔ اس کی ایک وجہ سفر، سفارت کاری کے امور کی انجام دہی میں عطاء الحق قاسمی نے مختلف ممالک کی تعیناتی کے دوران مختلف یورپی ممالک کے اسفار کیے اور ان کے سفر نامے معاصر سفر نامہ نگاروں کی نسبت سماجی اور ثقافتی حوالے سے زیادہ ممد و معاون ثابت ہوئے جس سے سفر نامہ نگاری کی صنف کو یازاویہ اور نیارخ ملا۔

عطاء الحق قاسمی کی اس راہ پر دوسرے سفر نامہ نگار بھی چلتے دکھائی دیئے۔ عطاء الحق قاسمی کیونکہ ایک بلند پایہ سفر نامہ نگار ہیں۔ ان کے اسفار میں فکری و فنی دونوں زاویے ملتے ہیں کیونکہ قاری زندگی اور سماجی روایات کے حقیقی بیان اور تقابلی انداز بیان سے زیادہ خوشی محسوس کرتے ہیں۔ ڈرخائن کے نظریے کے مطابق معاشرہ وہ ہے جس میں قدیم روایات اور سماجی اقدار پائی جائیں۔ ایسے معاشرہ کو واحد ترقی یافتہ معاشرہ کہا جاتا ہے۔ ڈرخائن کے خیال میں لوگوں نے خودداری، غیرت اور عزت کے جذبات شریک ہوتے ہیں۔ ڈرخائن کے نظریے کے مطابق ہم عطاء الحق قاسمی کے اسفار میں سماجی طنز کا جائزہ لیا۔ عطاء الحق قاسمی سماجی طنز کے ذریعے اپنے عہدے اور جملہ مسائل بیان کے ذریعے موجودہ پسندیدہ معاشرے کی تصویر کو واضح صورت دینے میں عام کردار ادا کیا ہے۔ میرے زیرِ نظر مقالے کا مقصد ان کے سفر نامہ نگاری کے سماجی طنز کے پہلوؤں کو منظرِ عام پر لاتا ہے۔

iii. مقاصدِ تحقیق

۱۔ عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں سماجی طنز کے فکری پہلو کا جائزہ لینا۔

۲۔ عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں سماجی طنز کے فنی پہلو کا جائزہ لینا۔

۳۔ عطاء الحق قاسمی کا ہم عصر سفر ناموں کے ساتھ سماجی طنز کے تناظر میں تقابل کرنا۔

iv. تحقیقی سوالات

۱۔ عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں دو تہذیبوں کا موازنہ کرتے ہوئے ان کے سفر ناموں میں سماجی طنز کی مختلف صورتوں کو دیکھا جائے گا؟

۲۔ عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں طنز کے فکری اور فنی زاویے کیسے ہیں؟

۳۔ عطاء الحق قاسمی معاصر سفر نامہ نگاروں سے سماجی طنز کے تناظر میں کیسے ممتاز ہوتے ہیں؟

v. نظری دائرہ کار

میرے تحقیقی مقالہ میں عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں سماجی طنز کے مسائل کے تجزیاتی مطالعہ کو سامنے لایا گیا ہے یہ اردو ادب کے ناقدین کی نگاہوں سے اوجھل رہے ہیں۔ موضوع کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں دونوں تہذیبوں کی ثقافتی اور سماجی عکاسی ملتی ہے جن میں ہمیں سماجی طنز مختلف صورتوں میں نظر آتا ہے۔ یہ کام اس لیے بھی اہم ہے یہ تحقیقی و تنقید کے سانچے میں اسے پرکھنا ضروری ہے۔ زیرِ نظر مقالہ عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں سماجی طنز کے حوالے سے موضوع بحث ہے۔

vi. تحقیق کی اہمیت

عطاء الحق قاسمی ایک نامور ادیب ہیں۔ ان پر کئی حوالے سے تحقیقی کام ہو چکا ہے جبکہ ان کے سفر ناموں میں سماجی طنز کے حوالے سے ابھی تک کوئی کام نہیں کیا گیا۔ عطاء الحق قاسمی کے سفر نامے ان کی شگفتہ نگاری اور مشاہدے کی گہرائی کے بے مثال نمونے ہیں۔ ان کے سفر ناموں میں سیاحت کے مختلف رنگوں کے ساتھ ساتھ ان میں طنز و مزاح کے عناصر بھی واضح ملتے ہیں۔ ان کے سفر نامے نہ صرف اسلوب اور فن کے حوالے سے منفرد ہیں بلکہ فکر کے حوالے سے بھی ان میں جدت و ندرت ملتی ہے۔ مصنف اپنے سفر ناموں کو کسی خطے یا جغرافیائی حالات یا تاریخ پر مشتمل کتاب بننے نہیں دیا بلکہ اس میں عصری، سیاسی، سماجی، اخلاقی اور معاشی صورتحال کو بیان کیا ہے۔

vii. تحقیقی طریقہ کار

موجودہ تحقیقی موضوع عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں سماجی طنز کا مطالعہ ہے۔ مذکورہ تحقیق میں دستاویزی اور تاریخی طریقہ کار اپنایا جائے گا۔ اس ضمن میں تحقیق کے لیے مندرجہ ذیل طریقہ کار اپنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

۱۔ بنیادی مآخذ کی رسائی کے لیے عطاء الحق قاسمی بالخصوص، جمیل الدین عالی اور مستنصر حسین تارڑ کے براہِ راست رابطہ کیا گیا ہے۔

۲۔ تحقیق کے دوران معاصر ادبی جرائد میں ان کے فن و فکر پر ہونے والی تحقیق مشعلِ راہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

۳۔ مختلف کتب خانوں، الیکٹرانک، میڈیا و انٹرنیٹ سے شواہد کے حصول کی ہر ممکن جمع آوری کی گئی ہے۔

viii. مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق

عطاء الحق قاسمی پر مختلف زاویوں سے تحقیق ہو چکی ہے۔ عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں سماجی طنز کے موضوع پر باقاعدہ کوئی تحقیق سامنے نہیں آئی۔ وہ موضوعات جن پر پہلے تحقیق ہو چکی ہے وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ عطاء الحق قاسمی کی تحریریں سیاسی اور سماجی تناظر میں (مقالہ برائے ایم فل اردو) خاور نوازش ، بہاؤالدین ذکریہ یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۱۳ء

۲۔ عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں جذبہ حب الوطنی (مقالہ برائے ایم۔اے اردو) سدرہ نوشین، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۴ء

۳۔ عطاء الحق قاسمی، مستنصر حسین تارڑ اور انتظار حسین کے سفر ناموں میں تہذیبی عناصر (مقالہ برائے ایم فل اردو) فضیلت بانو، جی سی یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۷ء (غیر مطبوعہ)

ix. تحدید

عطاء الحق قاسمی ہمہ جہت شخصیت ہیں ۔ وہ کالم نویس، شاعر اور ادیب ہیں لیکن مجوزہ مقالہ صرف سفر نامہ نگاری تک محدود رہے گا۔ اس مقالے میں سماجی طنز کے عناصر کو دیکھا جائے گا۔ زیرِ تحقیق سفر ناموں کے عنوانات بالترتیب یوں ہیں:

"شوقِ آوارگی"، "گوروں کے دیس میں"، "دنیا خوبصورت ہے" اور "دلی دور است"

x. پس منظری مطالعہ

عطاء الحق قاسمی کی تحریروں کے حوالے سے شائع ہونے والے مضامین کا مطالعہ کیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی ان کے حوالے سے لکھی گئی تحقیقی و تنقیدی کتب کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

ب: سفر نامہ اور اُس کا فن

انسان فطری طور پر تبدیلی پسند اور مہم جو ہے لہٰذا اپنی کھوج اور فطرت کے مطابق ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر میں رہتا ہے۔ زمانہ قدیم کی داستانوں میں انسان کے تخیلاتی یا حقیقی سفر کی داستان نو کو خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ داستان کسی ایک قوم خطے یا زبان سے وابستہ نہیں بلکہ تاریخ انسانی میں ایسی بے شمار مثالیں نظر آتی ہیں جس میں انسان نے سفر کے ذریعے متنوع تجربات اور احساسات کو حصول کے لیے ممکن بنایا ہے۔ اطلاعات اور ذرائع آمدورفت کے جدید وسائل کی آمد سے پہلے انسانی سفر تجربات کے ساتھ ساتھ ایک افسانوی حیثیت کا بھی حامل رہا ہے۔ کسی گاؤں، دیہات وغیرہ میں اس شخص کی بات کو دیگر لوگوں کی نسبت زیادہ وقعت اور حیثیت حاصل ہوتی ہے جس نے اپنے علاقے اور زبان کی حدود سے دور سفر اختیار کیا ہوتا تھا۔ آمدورفت کے جدید اور آرام دہ ذرائع آنے کے بعد جہاں سفر آسان ہوا ہے وہاں نسلوں، زبانوں اور انسان کی مختلف تہذیبوں کے مابین تبادلے میں بھی تیزی آئی ہے۔

زندگی کا ہر مرحلہ حرکت اور تغیر سے عبارت ہے۔ انسان کے ہر بدلتے لمحے کے ساتھ ساتھ خود کو ہم آہنگ کرنے اور معاملات کو درست کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے زندگی کے اس طویل اور صبر آزما کوشش کے دوران ہر لمحہ نئے تجربے اور احساسات آتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید اس بارے میں کہتے ہیں:

> ”سفر کا سب سے قیمتی عنصر اس کی حرکت ہے اور زندگی چونکہ مسلسل حرکت ہے اس لیے سفر بھی زندگی کا استعارہ ہے۔“ (۱)

پہلے سفر نامے داستانوں کی صورت میں معرضِ وجود میں آئے۔ لیکن بعد میں ترقی کے ساتھ ساتھ سفر ناموں کو الگ حیثیت دی گئی ہے۔ اردو میں موجود قدیم سفر نامے تخیل اور حقیقت کا ایسا مرقع ہے جس میں تجربہ اور حسن ایک ساتھ جلوہ گر نظر آتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا کہ موجودہ دور میں انسان مواصلات اور آمدورفت کے ذرائع کے لحاظ سے بے حد ترقی یافتہ ہے لہٰذا تخیل کی بجائے انسان حقیقت کی تلاش میں ہے اور حقیقت پسند بھی یوں موجودہ انسان تخیلاتی باتوں اور خوبصورت طرزِ نگارش سے زیادہ حقیقت نگاری اور انسان سے ربط کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔

تغیر اور حرکت زندگی کا استعارہ ہے لہٰذا حقیقت سے قریب تر لکھنا موجودہ قارئین کو نہ صرف پسند ہے بلکہ وہ ان کو اپنے تجربات اور احساسات کا حصہ بنانے میں فرصت محسوس کرتے ہیں۔ موجودہ سفر نامہ میں حالات کے سماجی اور لسانی بیان کے ساتھ ساتھ ایک مصنف اقتصادی پہلو کو بھی بڑی صراحت سے بیان کرتا ہے اور اس مقصد کے لیے وہ کوشش کرتا ہے کہ ان وجوہات کا بھی پتہ لگایا جائے جن کی بدولت مذکورہ خطے یا ملک نے ترقی کی یا زوال پذیر ہوئے۔ سفر میں نہ صرف بوریت ختم کرنے، اس کو تازہ دم کرنے اور اس کے معمولات میں دلچسپی پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے بلکہ یکسانیت سے چھٹکارا دلا کر معاملات زندگی بہتر تفہیم اور حل میں بھی مددگار ثابت ہوتا ہے۔

سفر نامہ یوں تو اپنی سفری روداد بیان کرنے کا نام ہے۔ مگر حقیقتاً موجودہ دور میں سفر نامہ نگار کو سفر کے ساتھ ساتھ اس جگہ یا ملک کے چند ایسے پہلو بیان کرنے پڑتے ہیں ان کی مدد سے سفر نامے میں چاشنی پیدا ہو سکے۔ کیونکہ ذرائع آمدورفت اور مواصلات کے اس ترقی یافتہ دور میں عمارتوں کی ساخت پر بات کرنا قاری کو اچھا نہیں لگتا اس لیے موجودہ سفر ناموں میں ماضی کی داستانوی انداز کے بجائے اقتصادی اور سماجی پہلو بھی شامل کرنے پڑتے ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ سفر نامہ نگار کی روداد سفر کے ساتھ ساتھ اقتصادی، سیاسی اور سماجی نکتہ نگاہ کا حامل بھی بن جاتا ہے۔

> "سفر انگریزی کے لفظ Travel کا متبادل ہے۔ جس کے لغوی معنی سفر کرنا، سیاحت کرنا، جائزہ لینا، مشاہدہ کرنا، قطع کرنا، مسافت کرنا، حرکت کی رفتار یا حد کے ہیں۔"(۲)

وہ کتاب جو سفر نامہ نگار سفر یا سفر سے واپسی پر اپنے تجربات اور تاثرات و احساسات کو ترتیب دے کر جو تحریر کرتا ہے۔ وہ سفر نامہ کہلاتی ہے۔

فیروز اللغات میں سفر نامہ کے معنی یوں دیے گئے ہیں:

"سفر کے حالات پر کتاب یا سیاحت نامہ۔" (۳) سیر و سیاحت انسان کی فطرت میں ہمیشہ سے شامل رہا ہے کیونکہ فطری طور پر انسان تنوع پسند ہے۔ وہ ایک ہی جگہ پر رہ کر اکتا جاتا ہے۔ عارضی طور پر اپنے معمولات اور جگہ میں فرق لانے سے اس کی یکسانیت اور بوریت ختم ہو جاتی ہے اور یہ نقل مکانی اس کے لیے تفریح کا باعث بنتی ہے او جب سفر سے لوٹتا ہے اور وہ خود کو تازہ دم محسوس کرتا ہے۔

شان الحق حقی نے فرہنگِ تلفظ میں سفر نامے کے بارے میں لکھا ہے:

"سیاحت کی روداد، سفر کا تحریری احوال۔" (۴) خالق کائنات کی بنائی ہوئی ہر چیز اس وسیع و عریض کائنات میں ہر وقت حالتِ سفر میں نظر آتی ہے۔

نفیسہ حق سفر کے بارے میں کچھ اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہیں:

> "سفر عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی مسافت طے کرنا، سیاحت کے لیے نکلنا ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا، ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل ہونے کے ہیں۔ اردو زبان میں یہ لفظ عربی سے مستعار ہیں اور انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ "نامہ" فارسی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے لغوی معنی ہیں خط، فرمان یا مجموعی طور پر تحریر شدہ عبارت۔ اس لیے اردو کے علماء نے "سفر" عربی سے اور نامہ فارسی سے لے کر سفر نامہ کی اصطلاح وضع کی ہے۔ اردو میں سفر نامہ کے معنی روداد یا سفری تجربات و مشاہدات رقم کرنے کے ہیں۔" (۵)

زندگی کو سفر سے تشبیہہ دی جاتی ہے اور دورانِ سفر ہی انسان کو جن تجربات سے گزرنا پڑتا ہے اس کا حصول عام زندگی میں ممکن نہیں۔

ڈاکٹر قدسیہ قریشی سفر نامے کے بارے میں لکھتی ہیں:

"سفر نامے کے معنی داستان سفر، رودادِ سفر یا سفر کے قصے ہیں جسے تحریری طور پر پیش کیا گیا ہو۔ انگریزی میں اس سفر کو بیان کرنے والی متحرک تصاویر یا مصور تقریر بتایا گیا۔"(۶)

سفر نامے کا شمار اردو ادب کی بیانیہ اصناف میں ہوتا ہے اور چشم دید واقعات پر لکھا جاتا ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ سفر میں ہونے والے انجانے واقعات نئی گلیوں کی سیر، نئی فضاؤں سے واقفیت ہو اور عجیب و غریب ہونے والے مشاہدوں کے تصورات سے وابستگی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ سفر میں تحیر کا عنصر فطری طور پر شامل ہے اور یہ تحیر ہی انسان کو سفر کے لیے مجبور کرتا ہے۔

ڈاکٹر خالد محمود اس ضمن میں یوں رقمطراز ہیں:

"سفر نامہ نگار دورانِ سفر یا سفر سے واپسی پر اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات اور تاثرات و احساسات کو ترتیب دے کر جو تحریر رقم کرتا ہے وہ سفر نامہ ہے۔"(۷)

سفر جیسا بھی ہو سیاح یا مسافر کے وابستگان اس بات کے آرزومند ہوتے ہیں کہ سفر کے تجربات سے زیادہ سے زیادہ آگہی حاصل کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کریں اور یہ بات ان ممالک میں ہمیں زیادہ نظر آتی ہے جہاں معاشرہ ایک خاص تہذیبی اور نظریاتی چار دیواری میں ہی گھومتا نظر آتا ہے۔ فرد کو اس چار دیواری میں ہی گھومتا نظر آتا ہے۔ فرد کو اس چار دیواری سے باہر نکلنے کے مواقع کم ملتے ہیں۔ ایسے معاشرے جو دور دیس سے رہ کر ہر چیز الف لیلوی نظر آتی ہے۔ اور تب ہی قاری کرید کرید کر یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ مسافر نے کیا دیکھا ہے۔ سفر کیسے گزارا؟ اس میں اس نے کیا کھویا ہے کیا پایا ہے؟ اس لیے کہہ سکتے ہیں جو لوگ سفر نہیں کر سکتے وہ کوائف سفر بن کر اپنے ذوق سفر کو تسکین دے سکتے ہیں۔ سفر نامہ نگار اپنے تجربات تاثرات اور محسوسات کو قاری کے سامنے بیانیہ انداز میں بیان کرتا ہے۔ اس لیے اسے چاہیے کہ وہ سفر کے دوران اپنی تمام حسیات کو بیدار رکھے اور اپنے اردگرد ہونے والے حالات و واقعات کا جائزہ باریک بینی سے لے سفر نامہ نگار جس قدر باریک بین ہو گا اتنا ہی وہ منظر کی عکس بندی کرنے میں کامیاب رہے گا۔ ایک اچھے سفر نامہ نگار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ایک اچھا سفر نامہ نگار قاری کو اپنے احساسات اور جذبات میں بھی شریک کرتا ہے۔

سفر جو دوران سفر وہ مناظر دیکھنے کے بعد اس پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ ہر انسان کی چیزوں کو پرکھنے کی اپنی نگاہ ہوتی ہے۔ سفر نامہ نگار اپنی قوتِ مشاہدہ کا استعمال کر کے خارجی حقائق میں پوشیدہ حقیقتوں تک پہنچتا ہے۔ جہاں ایک عام آدمی کی نظر نہیں پہنچ سکتی ہے۔

ذوالفقار علی احسن رقمطراز ہیں:

> "سفر نامہ نگار قاری کے سامنے تمام واقعات اور مشاہدات اس طرح پیش کرتا ہے کہ تمام مناظر قاری کے سامنے رقص کرنے لگتے ہیں اور قاری محسوس کرتا ہے کہ جیسے وہ سفر نامہ نگار کے ساتھ اس سفر میں شریک ہے۔"(۸)

انسانی زندگی میں سفر کی اہمیت سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن پاک میں بھی مطالعہ کرنے کا بار بار حکم دیا گیا ہے۔ شاید اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے دوسری اقوام کی نسبت زیادہ سفر کیا ہے۔ انسان کی زندگی میں سفر ایک حرارت بخش غذا ہے جو انسانی اعضاء کو دل و دماغ کی تازگی کا احساس دلاتی ہے۔ سفر کے وسیلے سے مسافر کی شخصیت میں ہواؤں کی پاکیزگی اور لطافت پھلوں کا حسن حوصلہ اور بلند پروازی اور عظمت سمندروں کی گہرائی اور وسعت کے چراغ روشن ہو جاتے ہیں۔ سیاحت سے ہمیں دوسرے ممالک کی تاریخ، جغرافیہ اور اقوامِ عالم کے اخلاق و عادات، رسوم و رواج اور تہذیب و ثقافت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ۚ ثُمَّ اللَّهُ يُنشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔(۹)

(قرآنی آیت: سورۃ العنکبوت، آیت:۲۰، پارہ:21۔۲۲)

سفر کا سب سے قیمتی عنصر حرکت ہے اور زندگی چونکہ خود مسلسل حرکت کا نام ہے اس لیے سفر بھی زندگی کا ایک استعارہ ہے۔ حکمائے قدیم نے اس کے بارے میں کہا ہے۔ سفر ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ اسلامی تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ حضرت آدمؑ کی داستان حیات میں شجرِ ممنوعہ کو چکھنے کا بظاہر یہ واقعہ احکام ربانی کی خلاف ورزی اور آدم کی اولین بغاوت سے متعلق ہے۔ اس گناہ کی وجہ سے آدم کو جنت سے نکال دیا گیا ہے۔ اور کرہ ارض پر بھیج دیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ پہلا سفر تھا۔ اس وقت سے لے کر آج تک آدم کے پاؤں سے یہ چکر نہ نکال سکا۔ یہی دلچسپ بات ہے جس کی وجہ سے "سیر وفی الارض" کا حکم ربانی نافذ کیا گیا ہے۔

تجربات حیات کو مسئلہ ظفر قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں بہت سے انبیاء کرام کے سفر کے حالات ہمیں ملتے ہیں۔ جن میں حضرت نوحؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت یوسفؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے اسماء حسنہ مثال کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی رقمطراز ہیں:

"سفر اور متعلقات سفر پر، خواہ وہ سفر ابدی ہو یا ارضی، جتنا لٹریچر آپ کو مسلم ادبیات میں ملتا ہے اس کا عشر عشیر بھی دیگر تہذیبوں کے ادب میں نہیں ملتا۔"(۱۰)

ابتدائی دور میں سفر نامے کا مقصد صرف یہی ہوتا تھا کہ جس مقام یا ملک کی سیر کی جاتی ہے۔ اس کے بارے میں جغرافیائی یا تاریخی معلومات کو فراہم کرنا تھا اور یہ سفر نامے لوگ بہت شوق سے پڑھا کرتے تھے اور مثلاً شبلی نعمانی کا سفر نامہ مصر روم شام اور سر سید احمد خان کا مسافرانِ لندن ان وجوہات کی وجہ سے ہمارے ذرائع و رسائل اور مواصلات ترقی نہ کر سکے اور لوگ مہینوں سفر کیا کرتے تھے۔ اور اس وقت کے لوگ ایک دوسرے ممالک کے بارے میں بہت کم معلومات رکھتے تھے۔

ڈاکٹر انور سدید اس بارے میں کچھ اس طرح خیال کرتے ہیں:

"ایک اچھے سفر نامے میں سیاح اور ادیب دونوں ہاتھ میں ہاتھ ملا کر چلتے ہیں۔ سیاح اپنے تیز باصرہ سے ماحول کی جزئیات کو خوبصورت، دلکش اور جاذب توجہ اسلوب میں یوں پیش کرتا ہے کہ پورا منظر متحرک ہو کر قاری سے ہمکلام ہو جاتا ہے۔"(۱۱)

لوگ دوسرے ممالک کی تاریخ اور جغرافیائی معلومات کرنے کے لیے بہت شوق سے ان سفر ناموں مطالعہ کرتے تھے۔ آج کے دور کی بات کریں تو ہم دیکھتے ہیں۔ اب سفر کرنا مشکل نہیں رہا۔ انسان میلوں کا سفر چند گھنٹوں میں طے کر لیتا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے باعث دنیا سکڑ کے ایک عالمی گاؤں میں تبدیل ہو گئی ہے۔ تو اب انسان کے لیے کسی ملک یا خطہ کے بارے میں معلومات کو حاصل کرنا مشکل نہیں رہا اسی وجہ سے اب ان سفر ناموں کی اہمیت ختم ہو گئی ہے۔ اب قارئین ان سفر ناموں کو پڑھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جن سفر ناموں خارجی حقائق اور مشاہدات کی بہ نسبت نجی تجرباتِ تاثرات زیادہ ہوں۔

اس حوالے سے ڈاکٹر خالد محمود یوں رقمطراز ہیں:

"تاریخ، جغرافیہ، تہذیب، تمدن، تعلیم، تربیت، سیاست، معاشرت، مذہب، ادب اقتصادیات غرض بیسوں ایسے موضوعات ہیں جو قدیم سفر ناموں کے دامن میں ہیرے، جواہرات کی طرح جگمگا رہے ہیں۔ پرانے زمانے میں جب آمدورفت رائج تھی۔ اس قسم کے معلومات افزاء واقعات اپنے اندر بڑی کشش رکھتے ہیں۔ تاریخی واقعات اور آثارِ قدیمہ سے متعلق قصے کہانیاں یا مناظر فطرت کے مرقعے ہر چیز کے بارے میں واقفیت حاصل کرنے کے لیے طبعیت بے چین رہتی تھی۔" (۱۲)

اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ جدید سفر ناموں میں خارجیت کی نسبت داخلیت کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ ہم آج بھی دیکھیں بہت سے سفر نامہ نگار ایسے ہیں جو کہ سفر نامے میں معلومات اور جغرافیائی معلومات کا انبار لگا دیتے ہیں جبکہ ہم یہ تمام معلومات کسی بھی ملک کے دفتر یا سیاحت کے کتابچوں سے بآسانی حاصل کر سکتے ہیں۔ سفر نامے میں معلومات ہی نہیں ہونی چاہیے بلکہ سفر نامہ نگار کو حقیقت بیان کرنی چاہیے۔ مصنف اگر حقیقت کو بیان نہیں کرے گا تو اس سے سفر نامے کی روح مفقود ہو کر رہ جائے گی۔

سفر نامے کو ان تمام خصوصیات کی وجہ سے دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ قدیم سفر نامے جس میں خارجی معلومات کو بیان کیا جاتا ہے۔ آخر الذکر داخلی کیفیات اور احساسات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ سفر نامے میں اسلوب اور طریق اظہار کی بہت زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ اس طرح کوئی بھی صاحبِ طرز سفر نامہ لکھتا ہے تو وہ اپنے طرزِ بیان سے اپنے سفر نامے میں چار چاند لگا سکتا ہے جس سے قاری پڑھ کر لطف اندوز ہو جاتا اور وہ سمجھتا ہے کہ میں خود اس کی سیر کر کے آیا ہوں۔

سفر نامہ تکنیک کے اعتبار سے بیانیہ صنف میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ سفر نامہ میں کوئی خاص تکنیک نہیں ہوتی۔ اس میں کچھ باتوں کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ایک ادیب جب سفر نامہ لکھتا ہے تو خود ایک اسلوب کو وضع کر لیتا ہے جو سفر نامے کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ سفر نامہ نگار کسی بھی چیز کا پابند نہیں ہوتا وہ آزاد ہے جس طرح چاہے وہ اپنے مشاہدات و تجربات کو تحریر کر سکتا ہے لیکن اس کے لیے اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ وہ سفر نامے کو سفر نامہ ہی رہنے دے داستان یا ناول بنانے کی کوشش نہ کرے کیونکہ سفر نامہ نگار

سفر نامے کو دلچسپ بنانے کے لیے مختلف انداز اپناتا ہے ایسے بیان کرتا ہے جیسے وہ بے مرقع لطائف کا استعمال کرنا۔ افسانوی انداز کو لایا جائے تاکہ مبالغہ آرائی کو پیدا کیا جائے۔ ایسے لکھنے سے سفر نامے کی روح مجروح ہو جاتی ہے۔ اگر سفر نامہ نگار جب یہ سوچ کر لکھتا ہے وہ خود تکنیک کو وضع کر لیتا ہے۔ تکنیک کو استعمال کرنے سے سفر نامے میں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے اور قاری پڑھتے ہوئے اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی اس سے سفر نامہ نگار قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور قاری پڑھتے ہوئے یوں محسوس کرتا ہے۔ جیسے وہ خود سفر کر رہا ہو۔ اس سے پڑھنے والے کو اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> ”تکنیک کا موزوں انتخاب سفر نامے کی دلچسپی اور اس کے فنی حسن میں اضافہ کرتا ہے تاہم اصل اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ سیاح نے اپنی قوت باصرہ سے کس طرح کام لیا ہے اور واقعات کو اخذ و اکتساب کے لیے اپنی ذہنی بصیرت کو استعمال کیا ہے۔“ (۱۳)

سفر کا عمدہ مواد کو سادہ الفاظ میں پیش کر دیا جائے تو وہ قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اگر مواد اچھا نہ ہو تو اچھی تکنیک بھی سفر نامے کی داخلی خوبیوں کو اجاگر کرنے میں مدد نہیں کر سکتی۔ ابتدائی اور قدیم سفر نامے بیانیہ تکنیک میں ہی لکھے جاتے تھے۔ آج بھی جدید سفر نامہ اسی تکنیک میں پیش کیا جا رہا ہے کیونکہ سفر نامہ میں واحد کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں آپ بیتی کا انداز آتا ہے۔ جس سے دلچسپی کا عنصر بڑھ جاتا ہے۔ سفر نامے میں سفر نامہ نگار میں ہیرو کے طور پر نظر آنے لگتا ہے۔ سفر نامہ میں اس بات کو اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ سفر نامہ نگار ان تمام واقعات کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھے جو دورانِ سفر اُس کو پیش آتے ہیں۔ اس لیے سفر نامہ نگار کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ سفر کرتے ہوئے اپنے پاس ڈائری یا کاپی کو پاس رکھے واقعات کو ساتھ دیکھ کر محفوظ کر لے۔ اس تکنیک سے لکھے جانے والے سفر ناموں میں نہ صرف تاریخ کا صحیح تعین ہوتا ہے۔ بلکہ حادثات و واقعات پر سیاح کا فوری رد عمل بھی ظاہر کر دیتا ہے۔ ان سفر ناموں میں صداقت پائی جاتی ہے اور تخیل کی آمیزش کم ملتی ہے۔ اس میں سیاح اپنی ذات سے ہمکلام ہوتے ہوئے نظر آتا ہے جس سے حسن اور گہرائی پیدا ہو جاتی ہے اور صیغہ حال کے استعمال کی وجہ سے سب کچھ آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہوتا ہے۔ سفر کے دوران میں لکھے گئے سفر ناموں کی دوسری تکنیک ہمیں ملتی وہ خطوط کی تکنیک استعمال کی گئی ہیں۔ اس تکنیک

میں مکتوب الیہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اس میں تمام مشاہدات و تجربات کو بالواسطہ طور پر اپنے مخاطب کو منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جس سے دوران سفر واسطہ پڑتا ہے۔ اس تکنیک میں ماضی کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔ سفر نامہ نگار دوران سفر میں جو مناظر دیکھتا وہی بیان کرتا ہے۔

بقول ڈاکٹر انور سدید:

> "ڈائری کی خوبصورتی اس کی بے ربطی میں ہے لیکن خطوط کی بے ربطی مجموعی تاثر کو زائل کر دیتی ہے۔ چنانچہ ڈائری میں تخلیقی عمل بے ساختہ ابھرتا ہے۔ لیکن خطوط میں آرائش اور تخلیق مکرر کا وافر عنصر موجود نظر آتا ہے۔ ڈائری کی طرح خطوط بھی دوران سفر ہی لکھے جاتے ہیں۔ اس لیے ان کے تاثر میں صداقت کا عنصر موجود ہے اور قاری اسے دلچسپی سے پڑھتا ہے۔" (۱۴)

سفر نامہ نگار سفر ناموں کی تیسری تکنیک کو سفر نامہ کے آخر میں استعمال کرتا ہے وہ اپنی یادداشتوں کو محفوظ کر لیتا ہے۔ ان سب یادداشتوں کو سامنے رکھ کر ہی سفر نامہ مرتب کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے ایسے سفر ناموں میں حقیقت اور تخیل کا عنصر کم ملتا ہے۔ دنیا کے تمام سفر نامے اسی تکنیک میں لکھے گئے ہیں اور اس میں ماضی کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔

ج: سماجی طنز

ایک عام آدمی معاشرے میں ہونے والی ناہمواریوں اور کجرویوں کو دیکھنے کا عادی ہوتا ہے لیکن جب وہ اکتاہٹ کا شکار ہو جائے تو وہ گالم گلوچ کرنا شروع کر دیتا ہے جبکہ ایک ادیب ایسا کوئی بھی طریقہ نہیں اپناتا وہ معاشرے کی چھوٹی چھوٹی خرابیوں کو بڑی باریک بینی سے دیکھتا ہے اور ان کو بڑھا چڑھا کر قارئین کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ جس کی نمایاں اور بگڑی ہوئی صورت کو دیکھ کر مضحکہ خیزی پیدا ہو جائے اور سوچ کی نئی راہیں بھی متعین ہوتی ہیں اس سے پہلی صورت مزاح نگاری سے پیدا ہوتی ہے۔ جبکہ دوسری صورت طنز کے نتیجے میں وجود میں آتی ہے۔

اشفاق احمد ورک لکھتے ہیں کہ:

"اردو میں طنز ایک رجحان، رویے یا اسلوب کا نام ہے جبکہ انگریزی میں تو یہ بطور ایک صنف کے رائج رہی ہے۔" (۱۵)

انگریزی زبان میں لفظ "طنز" کا مترادف " Satire" ہے۔ جو کہ لاطینی زبان کے لفظ " Satire" سے نکلا ہے۔ جس کے لغوی معنی تو پھلوں سے بھری طشتری کے ہیں۔ لیکن اصطلاح میں اس سے مراد لاطینی زبان میں دوسری صدی قبل مسیح میں شروع ہونے والی وہ صنف برائیوں اور بوالعجیبوں کا تنقیدی انداز میں جائزہ لینا ہے۔

فارسی زبان میں طنز کے معنی افسوس کرنا، مذاق کرنا، طعنہ دینا، ہنسی اڑانا یا سرزنش کرنا وغیرہ۔ بہت سے لوگ لفظ "ہجو" استعمال کرتے ہیں۔ فارسی زبان و ادب میں طنز و ہجو ایک ہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ بعض جگہوں پر ظرف ہجو ہم معنی استعمال ہوتے ہیں لیکن بعض ناقدین اس کو الگ الگ اصطلاحات کے درمیان نمایاں فرق رکھتے ہیں ان کے ہاں ان دونوں کا مقصد اگرچہ گھاؤ لگانا اور توڑ دینا ہی ہوتا ہے جبکہ طنز میں اصلاح کا مقصد کارفرما بھی ہوتا ہے۔ ہجو کا مقصد صرف خراب کرنا، ذلیل کرنا اور بگاڑ دینا ہے۔ طنز کا مقصد اجتماعی زندگی کی تطہیر کرنا ہے۔ جبکہ ہجو چاہے کتنی ہی لطیف ہو اس میں وقتی یا ذاتی تفریح کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ طنز میں موجودہ حالات میں کسی موثر تبدیلی یا اہم موڑ کا سبب بنتی ہے۔

پروفیسر کلیم الدین احمد اپنے مضمون اردو ادب میں "طنز و ظرافت" میں طنز کے لیے ہجو اور طنز نگار کے لیے ہجو گو یا ہجو نگار کے الفاظ کرتے ہیں۔ وہ طنز نگار اور ظرافت نگار کی حدود کا تعین کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ظرافت نگار کسی مشاہدہ کو دیکھ کر مسکرا اٹھتا ہے۔ لیکن اور کسی قسم کا جذبہ اس کے دل میں نہیں ابھرتا۔ اسی جگہ ظرافت نگار اور ہجو گو کی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ ہجو گو بے ڈھنگے پن، ناقص، بدصورت منظر کو دیکھ کے بے تاب ہو جاتا ہے۔ ناانصافی، بے رحمی، ریاکاری کی مثالیں دیکھ کر اس کے دل میں نفرت، غضب، حقارت اور اسی قسم کے جذبات ابھرنے لگتے ہیں۔ اس کی ہجویں انھی جذبات کی ترجمان ہوتی ہیں۔ وہ صناع ہے۔ اس لیے وہ اپنے جذبات کو سیدھے سادھے طور پر بیان نہیں کرتا۔۔۔ بلکہ ان کو قابو میں لا کر ان کا

صنعت کارانہ اظہار کرتا ہے۔۔۔۔۔وہ ہنستا بھی ہے اور روتا بھی ہے وہ ہمدردی، ترحم انصاف، قیاضی کے جذبات کو ابھرتا ہے اور ساتھ ساتھ وہ غصہ بعض حقارت کے جذبات کو بھی بھڑکاتا ہے۔ ظرافت نگار کے مقابلے میں اس جذباتی دنیا زیادہ وسیع اور کشادہ ہے۔"(۱۶)

مزاح ااور ظرافت طنز کے بغیر بھی کیا جاسکتا ہے لیکن طنز کے ساتھ مزاح کی چاشنی ہونا بے حد ضروری ہے۔ طنز آپریشن کرنے کا عمل ہے۔ تو مزاح اس میں کلوروفارم سن کر دینے کا کام کرتا ہے۔ طنز نگار کا مقصد یہ ہو افراط و تعریض کے عالم میں بھی توازن کو تلاش کرے۔ اور معاشرے میں افراط و تفریط کی نشان دہی وہی شخص کر سکتا جو انبیاء اور حالات کے بارے میں معلومات رکھے۔ کسی بھی چیز کے بارے میں جاننے کے لیے اصل صورت سے شناسائی ضروری ہوتی۔ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی مزاح میں توازن کو ضروری سمجھتے ہیں اس لیے وہ اپنے پی۔ ایچ ڈی کے مقالے میں ایک طنز نگار کا مطمع نظر بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

"طنز نگار کسی عقلی و شعوری، نکتہ نظر سے فطری و جذباتی نظام پر حملہ کرتا ہے۔ اور کبھی فطری و جذباتی نکتہ نظر سے عقلی و شعوری نظام کا تمسخر اڑاتا ہے۔ مگر دونوں صورتوں میں ایک زیادہ صحت مند اور زندگی بخش توازن کی تلاش اس کا مطمع نظر ہوتی ہے۔"(۱۷)

جو طنز نگار توازن کو برقرار نہیں رکھ سکتا ہے۔ اس کا مطلب کہ وہ معیار کو قائم نہیں رکھ سکا۔ یوں طنز کے معیار کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو خوبصورت الفاظ کا جامع پہنایا جائے۔ وہ طنز کے معیار سے بھی دور جا پڑتا ہے۔ طنز کے اس بڑے معیار کو قائم کرنے کے لیے ڈاکٹر وزیر آغا نے خوبصورت الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔

"طنز کے لیے ضروری ہے کہ وہ مزاح سے بیگانہ نہ ہو۔ بلکہ کونپیں کو شکر میں لپیٹ کر پیش کرے۔ دوسرے کی پردہ داری اور عیب جوئی کرتے وقت لطیف فنکارانہ پیرایہ اختیار کرے۔ تیسرے کسی خاص فرد کے عیوب کی پردہ داری کو زندگی اور سماج کی عالمگیر ناہمواریوں کی پردہ داری کا وسیلہ بنائے، جہاں ایسا نہیں ہوتا طنز طنز نہیں رہتی محض پھبتی استہزایہ ہجو کی صورت اختیار کر جاتی۔"(۱۸)

لہٰذا ہم طنز کی مختلف تعریفوں کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ طنز جب مزاح کی چاشنی میں کیا جاتا ہے تو اس کی تلخی ختم ہو جاتی ہے اور خوبصورت اسلوب اور مناسب الفاظ تراکیب اسے کامیاب ادب پارہ بناتی ہیں۔

i. طنز و مزاح میں فرق

طنز و مزاح کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مزاح کا مقصد تفنن طبع اور تو دوسری افراط و تفریط میں تناسب اور توازن کو برقرار رکھنا ہے۔ طنز میں جوش، رنج، غصے اور بے چینی پائی جاتی ہے جبکہ مزاح میں زندہ دلی، رحم کا جذبہ ملتا ہے۔ طنز میں اگر مزاح کی چاشنی موجود نہ ہو تو طنز نگار کے لہجے میں اور اسلوب میں تہذیب و شائستگی کے بجائے غصے اور برہمی کا اظہار ملتا ہے۔ اس لیے طنز میں مزاح کا ہونا از حد ضروری ہے۔ اس سے ادبی لب و لہجے میں نکھار اور حسن پیدا ہو جاتا ہے۔

طنز اور مزاح کو بیک وقت دو مختلف چیزیں بھی سمجھا جاتا ہے جبکہ لازم و ملزوم بھی انگریزی ادب میں ان دونوں کی الگ الگ پہچان ہے۔ ان کو خصوصیات خراج اور تاثیر کے اعتبار سے الگ الگ اصناف میں شمار کیا جاتا ہے لیکن اردو ادب میں طنز و مزاح کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنا بہت مشکل کام ہے۔ طنز میں فن کی ضرورت ہوتی ہے۔ جبکہ مزاح طنز کا لازمہ ہے۔ طنز کا مقصد سوچنے کی دعوت اور اصلاح کی طرف لے کے جاتا ہے اور مزاح میں صرف ہنسی و مذاق ہے۔ طنز نگار کتنی بھی ناہمواریوں، بے ڈھنگے پن اور برائیوں کو دیکھ کر آگ بگولا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ بہتری لانے کی کوشش کرتا ہے جبکہ مزاح نگار کجرویوں اور ناہمواریوں کو دیکھ کر ہنس دیتا ہے او یہاں سے ہمیں دونوں فنکاروں کے راستے الگ الگ ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان دونوں کا مقصد اصلاحی ہوتا ہے لیکن ایک میٹھی گولیوں کے ذریعے کرتا اور دوسرا سرجری اور آپریشن کے ذریعے کرنا چاہتا ہے۔

ii. طنز و مزاح کے عناصر

طنز و مزاح کے بنیادی دو دھارے ہیں یعنی طنز اور مزاح۔ اردو ادب میں ان دونوں میں ایک واضح فرق نظر آتا ہے جس طرح ہر انسان ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کی شکل، مزاح اور کواکب ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں جبکہ اس کے پیدا ہونے کا انداز اور جسمانی اعضا ایک جیسے ہوتے ہیں اسی طرح کائنات میں تغیر و تبدل رہتا ہے۔ کوئی چیز اپنی جگہ پر جمود نظر نہیں آتی۔ ویسے بھی شاعرِ مشرق کے بقول کائنات کی نمود ہی رنگِ تغیر پر ہوئی ہے۔ خشتِ خاک کے اندر ازل ہی سے بے چینی اور بے قراری شامل ہے۔ اسی بے چینی اور اضطراب کو تسکین پہنچانے کے لیے کائنات کی ہر چیز، ہر رویے اور ہر رنگ ڈھنگ میں انقلاب برپا کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں کہ آئے دن ہر چیز میں تبدیلی آرہی ہے جسے کپڑوں کے ڈیزائن اور عمارتوں کے ڈیزائن تبدیل ہو جاتے ہیں۔ جوتوں اور بالوں کے فیشن تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ گاڑیوں کے نئے نئے ماڈل متعارف کروائے جارہے ہیں۔ یہاں تک کے گھروں میں بھی فرنیچر اور سامان ترتیب کو وقفے وقفے سے تبدیل کر دیا جاتا ہے۔

کیمیادان بتاتے ہیں کہ پہلے تین رنگ ہوا کرتے تھے یعنی سرخ، نیلا اور زرد لیکن آہستہ آہستہ انسان اپنے ذوق کی تسکین کے لیے انھی رنگوں کو اپنے نت نئے تجربات کے ذریعے ان کو بیسوں رنگوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہاں تک کپڑے ایک ہی تانے بانے کے ساتھ تیار ہوتے ہیں لیکن ڈیزائن اور کڑھائی سے کپڑوں میں جدت پیدا کر دی جاتی ہے اور بقولِ شاعر ایک مضمون کو بیان کرنے کے لیے سو ڈھنگ سے باندھنے کے کئی سامان کر لیے جاتے ہیں۔ ہم شگفتہ نگاری کی بات کرتے ہیں اس میں بھی کئی طرح کے شیڈ پیدا کر لیے گئے ہیں۔ یہ انسان کے اپنی مختلف حسوں، رویوں اور مزاجوں کو تسکین دینے کے لیے مختلف مواقع اور مختلف زمانوں میں بات کرنے کے لیے یہ طریقے اختیار کیے ہیں۔ شگفتہ نگاری میں طنز، مزاح، ظراف، بذلہ سنجی، رعایت لفظی، ہجو، ہجول، نغز چشمک، رمز ایہام فقرہ بازی، لطیفہ، ٹھٹھول، ریختی، تحریف، اشہرا، شوخی تشبیہہ، موازنہ تقلید خندہ آور نوک جھونک، پھکڑ بازی، عریانی و فحاشی، مزاحیہ کردار، لفظی ہیر پھیر، علامت اور مبالغہ وغیرہ شامل ہیں۔ یہ تمام طنز و مزاح کی ابتدائی صورتیں ہیں جن کا تکملہ اور منتہا طنز اور مزاح ہی ہیں۔

طنز و مزاح کے ان تمام مراحل صورتوں، کیفیات اور عناصر کا جائزہ لیا جائے گا۔ اور ان کا تعلق ان دونوں خاندانوں سے ہو گا۔ کوئی مزاح سے تعلق رکھتا ہو گا یا پھر طنز سے متعلق رکھتا ہو۔ ان تمام صورتحال میں یہی دونوں بنیادی رویے جھانکتے ہوئے نظر آئیں گے۔

۱۔ کم بیانی، رمز

رمز کا انگریزی مترادف Irony کیا جاتا ہے۔ یہ طنز کی ایک لطیف صورت کا نام ہے۔ اس کا طریقہ کار طنز و دشنام سے مختلف ہوتا ہے جبکہ رمز میں اصل روح (Under Statement) میں مضمر ہوتی ہے۔ طنز میں کسی چیز سے اختلاف کی لہر کو واضح ہو کر ہمارے سامنے لائی جاتی ہے۔ اس کے برعکس رمز میں شاعر یا مصنف بات یا نظریے کو تسلیم کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس میں الفاظ، لہجے اور انداز میں ایک ایسی برقی رو چھپی ہوتی ہے جو کو تھوڑا شامل کیا جائے تو فوراً سے سمجھ آجاتی ہے اس سے قاری کو کج ادائی اور بے راہ روی کا احساس دلا کر فوراً سے غائب ہو جاتی ہے۔ یہ طنز کی طرح کچھ کچوکے نہیں کھاتی ہے۔ بلکہ ارتعاش پیدا کر کے اپنا کام کر کے دکھاتی ہے۔ جیسا کہ اگر کسی پیٹو شخص کو کہہ دیا جائے کہ اس بیچارے کو تو بھوک ہی نہیں لگتی اور اس کا گزارا صرف پندرہ بیس روٹیوں پانچ سات گوشت کی بوٹیوں پر ہوتا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کا ایک فقرہ ہے:

> " آدمی ایک دفعہ پروفیسر ہو جائے تو عمر بھر پروفیسر ہی کہلاتا ہے۔ خواہ بعد میں سمجھ داری کی باتیں ہی کیوں نہ کرے۔ "(۱۹)

۲۔ ہجو

ہجو و طنز کو یکساں معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے جبکہ اس کے مفاہیم اور مقاصد میں واضح فرق ہوتا ہے۔ ہجو میں اصلاح کا پہلو نہیں ہوتا جبکہ طنز میں اصلاح کا پہلو شامل ہوتا ہے۔ ہجو کے معنی کسی شعر میں گالی یا برا بھلا کہنے کے ہیں۔ طنز اجتماعی چیز ہے جبکہ ہجو کو ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ہجو میں کسی کی تضحیک اور ذہانت کا جذبہ ہوتا ہے۔ وہ ہجو جس میں مدح کا ہلکا سا احتمال نکال سکتا ہو اسے ہجو ملیح کہتے ہیں اور وہ ہجو جس میں سراسر مذمت و نقوش کا پہلو ملتا ہو اُسے ہجو قبیح کہتے ہیں۔

ہجو اسلام سے قبل لکھی جاتی ہی ہے اس کا رواج عرب شعر سے چلا آرہا ہے۔ قبائل میں ایک شاعر ہوا کرتا تھا جو کہ مخالفین کے لتے پینے پر تعینات کیا جاتا تھا۔ سب سے پہلے ہجو کو عربی میں لکھا جاتا رہا اس کے بعد یہ رجحان فارسی میں آگیا۔ جہاں سوزنی، انوری، سنائی، سعدی، عبید زاکانی، خاقانی وغیرہ اس میں شامل تھے جنہوں نے اس میدان میں اپنا خوب خوب زورِ قلم دکھایا۔ اس کے بعد اردو میں اس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جن میں جعفر زٹلی، وجہی، غواصی، ولی، فراخی، مظہر جان جاناں، شاکر ناجی، حاتم، فغان، معین سودا وغیرہ شامل ہیں۔

۳۔ پھبتی، استہزا، تمسخر، طعن

جب ظرافت ایک خاص معیار سے نیچے کی طرف ہے اس میں پھکڑ پن آجاتا ہے بالکل اسی طرح جب طنز راستہ بھٹک جاتا ہے تو یہ اپنے اصل مقام سے نیچے گر جاتا ہے جس میں پھبتی تمسخر یا طعن و تشنیع کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ مزاح اور ظرفت کو ایک ایسی ڈھال سمجھا جاتا ہے جو کہ طنز کے تیروں کو اپنے جسم پر کند کر دیتی ہے۔ اس کا مقصد اصل ہدف کو براہ راست زخموں سے محفوظ کر کے اس میں احساس کا دیا جلانے کا فرض بخوبی نبھاتی ہے۔ اور جب طنز میں ظرافت اور مزاح شامل نہ رہے تو یہی لوگوں کی دلآزاری جگ ہنسی اور توڑ پھوڑ کا سبب بنتی ہے۔

۴۔ دشنام۔ گالی گلوچ

جب ظرافت اپنے خاص معیار سے گرتی ہے تو اُس میں عریانی و فحاشی ظاہر ہوتی ہے۔ اسی طرح طنز بھی جب اپنے تہذیب کے حدود کو عبور کرتا ہے تو دشنام کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں ہمیں عربی و فارسی میں ملتی ہیں اس کے علاوہ اُردو ادب میں اودھ پنچ کے شعراء کے ہاں تیرے بازی کی ایک روایت موجود ہے۔ ظفر علی خاں اور اقبال کے ہاں ہمیں یہ طنز تہذیب کے پردے میں دکھائی دیتی ہے اور بعض جگہ یہ بزرگ بھی آپے سے باہر ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

۵۔ فینٹیسی

فینٹیسی کو ایک صنف کے طور پر متعارف کروایا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کو طنز و مزاح کا ایک حربہ بھی کہا جاتا ہے۔ فینٹیسی میں فرضی کرداروں کی بجائے وقت کی اوڑھ کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اس میں ادیب کبھی ماضی کو حال میں بیان کر دیتا ہے۔ مستقبل کو حال میں بیان کرتا ہے اور کبھی ماضی و مستقبل دونوں کی طنابیں کھینچ کر حال میں یکجا کر کے بیان کر دیتا ہے۔ طنز نگار کو ان تمام حربوں کو استعمال کرنے میں آسانی ہوتی ہے کیونکہ طنز کے تیروں کی شدت وقت کی ڈھال میں گوارا ہو جاتی ہے اور ان مختلف زمانوں کی کیفیات اور شخصیات کو ایک جگہ جمع کرنے سے یا انہیں فرضی زمانے میں دکھانے میں جو صورت حال پیدا ہوتی ہے وہ بہت زیادہ دلنشیں اور فرحت افزا ہوتی ہے۔ اردو ادب میں فرحت اللہ کا "دلی کا ایک یادگار مشاعرہ" ایک پہلی کڑی ہے۔ اس کے علاوہ نسیم حجازی کا "سو سال کا" اور محمد خالد اختر کا سو سال بعد وغیرہ اس کی اہم مثالیں ہیں۔

۶۔ علامت

علامت کا رواج ادب میں اس وقت شروع ہوتا ہے جب زبان بندی کا دستور رائج ہو جاتا ہے۔ علامت کے ذریعے ادیب بات کو مختلف پردوں میں بیان کر سکتا ہے۔ ہمارے ہاں ایک طویل مدت سے آمریت اور مارشل لاء کا دور دورہ تھا۔ یہی وجہ ہے ہمارے ہاں علامت اور تجرید کی ایک معتبر روایت موجود ہے۔ علامت نگاری کا زیادہ استعمال ادیب نے افسانے میں استعمال کیا ہے اور اس کے ساتھ طنز اور مزاح میں بھی گاہے بگاہے بڑی خوبصورت اور دلکش علامتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

معروف مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی "آب گم" میں تیسری دنیا میں آمریت اور مارشل لاء کے اسباب کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

" تیسری دنیا کے کسی بھی ملک کے حالات پر نظر ڈالیں ڈکٹیٹر خود نہیں آتا۔ لایا اور بلایا جاتا ہے اور جب آجاتا ہے تو قیامت اس کے ہم رکاب آتی ہے۔ پھر وہ روایتی اونٹ کی طرح بدوؤں کو خیمے سے نکال باہر کرتا ہے۔ باہر نکالے جانے کے بعد کھسیانے بدر ایک دوسرے کا منہ نوچنے لگتے ہیں۔ پھر ایک نایاب بلکہ عنقا شے کی جستجو میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے سے زیادہ غبی اور تابعدار اونٹ تلاش کر کے اسے رشوت دینے کے منصوبے بنانے لگتے ہیں تاکہ اس کی پیٹھ کر اپنے خیمے میں رہ سکیں اور آقائے سابق الانعام یعنی پچھلے اونٹ پر تیر ابھیج دیں۔ "(۲۰)

عطاء الحق قاسمی نے بھی مارشل لاء کے دور میں بہت سے کالم لکھے۔ جس میں انھوں نے بہت خوبصورت انداز میں علامتوں کو استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر "بکریوں کے درمیان ایک شام"، "رب کا شکر ادا کر بھائی" "طوطے ای طوطے" اس میں مصنف نے آمریت کے دور کا سماں باندھا ہوا ہے۔

اکبر کے ہاں بھی علامت کا انداز دیکھنے کو ملتا ہے۔

۷۔ تحریف

تحریر میں ردو بدل کر دینا کہ اس سے معنی حیرت انگیز حد تک تبدیل ہو جاتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں پیروڈی اسے کہا جاتا ہے جس میں مروجہ قواعد و بیاں، روزمرہ محاورات، ضرب الامثال، مصرعوں، الفاظ و تراکیب میں ہوشیاری اور دانائی سے تصرف لایا جائے۔ پیروڈی کی ایک خاص شرط یہ بھی سامنے آتی ہے کہ فن پارہ اہم ہو اور اس میں اتنے سلیقے سے تبدیلی کی جانی چاہیے کہ وہ بھی ایک فن پارہ بن جائے۔

سید ضمیر جعفری نے "مسدس حالی" کی مدد سے مسدس بدحالی لکھ ڈالی۔

۸۔ موازنہ وتضاد

موازنہ کرتے ہوئے مزاح نگار مشابہت اور تضاد سے مضحکہ خیزی پیدا کرتا ہے۔ یہ مزاح نگاری کا ایک اہم حربہ ہے۔ اس میں دو چیزوں کو ایک ہی وقت میں تضاد اور مشابہت سے جو ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں جو ہنسی پیدا کرنے کا سبب بنتی ہیں اور مزاح نگار اس تخلیق کے لیے اس حربے سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس کی کچھ یوں ہے کوئی شخص سرکش آئینے ہیں اپنی بگڑی ہوئی شکل کو دیکھ لے۔ تو اس کی خود سے مشابہت اور اصلی صورت سے فرق پر مسکرا دے جیسا کہ پطرس اپنے مضمون "کتے" میں شاعروں اور کتوں کی طبعیت اور روانی کو خوبصورت انداز میں یکجا کر کے پیش کرتا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی "چراغ تلے" کے دیباچے میں اپنے احوال کو قلمبند کرتے ہوئے اپنی پسند کے ضمن میں کچھ اس طرح لکھتے ہیں۔

"غالب، ہاکس بے اور پھنڈی" [۲۱] انھوں نے کس طرح تین بالکل مختلف چیزوں کو بیک وقت ایک ہی پسند کے تحت اکٹھا کر کے ایک دلچسپ کیفیت پیدا کر دی۔ ایک جگہ وہ پھر لکھتے ہیں۔

"مولوی اور مرغی کے رزق کی فکر تو خدا کو بھی نہیں ہوتی" [۲۲] اس جملے میں مرغی اور مولوی میں حصول رزق یا تلاش رزق کی مشابہت اور تضاد نے کیا خوب مزا دیا ہے۔

۹۔ ایہام۔ رعایت لفظی، ضلع جگت

رعایتِ لفظی سے مراد ہے کسی لفظ یا جملے کو اس طرح برتا جائے کہ جس سے سننے والے کو اس لفظ کے دو مختلف مطالب کا احساس ہو۔ اس کی مدد سے ایسی بات کہی جاتی ہے جو عام انداز میں کہی جائے تو شاید رد عمل کے سوا کوئی نتیجہ نہ نکلے۔ رعایت، ایہام اور ضلع جگت کو ایک ہی چیز کے مختلف شیڈز بھی کہا جا سکتا ہے۔ شاعری میں اس کو ایہام اور نثر میں ضلع جگت کہا جاتا ہے۔ زمانہ قدیم میں شعراء کا ایہام گوئی ایک بڑا ہتھیار ہوتا تھا۔ یعنی شعر میں دو الفاظ استعمال کیے جاتے تھے۔ جن سے دو مفہوم نکالے جاتے تھے۔ ایک قریب کا دوسرا دور کا ہوتا تھا۔ شعر سنتے ہی جس سے ذہن میں قریب اور دور دونوں کے مفہوم آجاتے تھے جوں ہی جب دھیان دوسرے مفہوم کی طرف جاتا تھا تو اس میں طنز کے نشست کی چبھن محسوس ہوتی تھی اور بعض اوقات مزاح بھی ملتا تھا۔

۱۰۔ برجستگی بذلہ سنجی

لفظ "Wit" کا تعلق نکتہ آفرینی، ذہانت اور برجستگی سے ہوتا ہے جبکہ اردو میں اس کے مترادفات عموماً بذلہ سنجی اور نغز کے استعمال ہوتے ہیں۔ بذلہ بھی طنز و مزاح کی طرح عربی کا لفظ ہے۔

"فرہنگ آصیفہ کے مطابق جس کے معنی لطیفہ، چٹکلا، ظریفانہ اور خوشگوار بات کے ہیں۔"(۲۳) بذلہ سنجی کو مزاح کا کامیاب حربہ سمجھا جاتا ہے جبکہ اس میں فکر اور سنجیدگی کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ یعنی سنجیدہ گفتگو کرتے ہوئے یا تحریر کرتے ہوئے تڑپتی، مچلتی بات کو کہہ دینا جو قاری کو سوچنے پر مجبور کر دے بذلہ سنجی کہلاتی ہے۔

۱۱۔ ظرافت

اردو ادب میں مزاح اور ظرافت کو سگے بہن بھائی سمجھا جاتا ہے۔ مزاح اور ظرافت ایک دوسرے کے متبادل کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں اور اس سے صاف ظاہر اس کا تعلق مزاح کے خاندان سے ہے۔ انگریزی میں مزاح کے لیے "Humour" اور ظرافت کے لیے "Pleasantry" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سے مراد تحریر میں ایک خوشگوار کیفیت اور مزیدار صورتِ حال کا پیدا ہونا ظرافت ہے فارسی میں ظرافت کے لغوی معنی دانائی اور خوش طبعی کے ہیں۔

بقول یوسفی:

> "مزاح نگار کو جو کچھ ہوتا ہے وہ ہنسی ہنسی میں اس طرح کہہ جاتا ہے کہ سننے والے کو بھی بہت بعد میں خبر ہوتی ہے۔"(۲۴)

۱۲۔ صورتِ واقعہ

مزاح نگار ہمیشہ اپنی زندگی میں ہونے والے چھوٹے چھوٹے واقعات کو نہایت باریک بینی سے دیکھتا ہے اور پھر ان واقعات کو ہمارے سامنے اسی طرح پیش کرتا ہے ہمیں وہ واقعات دلچسپ لگتے ہیں۔ اور وہ واقعات ہمیں ترکیب و ترتیب کی وجہ سے وہ ہمیں پر لطف اور متاثر کن لگتے ہیں اس میں منظر سے زیادہ منظر نگار اہم ہوتا ہے۔ اس میں منظر نگار کا کمال ہوتا ہے کہ وہ منظر کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ قاری دل و دماغ پر اس طرح اثر کرتا ہے کہ وہ اس کے پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ بعض جگہوں پر یہ صورت حال مجموعی ہوتی ہے اور بعض جگہ

مصنف واحد متکلم کا استعمال کر کے خود کو بھی اس میں شامل کر لیتا ہے۔ جیسے پطرس بخاری میں سائیکل کے رواں ہونے کی صورت حال اور ابن انشاء کے ایک مضمون میں "ہم پھر مہمانِ خصوصی" میں پیش آنے والی دلچسپSituationاس سلسلے کی خوبصورت مثالیں ہیں۔

د: سماج اور ادب

سماجی تعلقات کا وہ نظام جس میں اور جس کے ذریعے ہم زندگی گزارتے ہیں۔ معاشرہ یا سماج کہلاتا ہے۔ سماجی تعلقات کے ساتھ مثلاً اس میں ہمارے اوہام وعقائد، افکار و تصورات، ہمارے فلسفہ حیات اور ہمارے کردار کی تشکیل و تعمیر کے ساتھ تاہم جڑ کر بنتا ہے۔ معاشرے کا لفظ خاندانوں پر مشتمل ایک گروہ، کبھی ایک قوم، کبھی پوری انسانی برادری کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سماج محض افراد کے مجموعے کا ہی نہیں بلکہ یہ افراد کے درمیان ربط و تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔ یہ افراد کے درمیان پائے جانے والے تعلق سے آگہی فراہم کرتا ہے۔ انسان شعور کی وجہ سے سماج میں پہچان اور تبدیلیوں سے آگہی حاصل کر لیتا ہے۔ اور یہ عمل ہمیشہ سے ہی ایسے جاری ہے۔ سماج میں انسان کی ترقی و تنزلی اسی شعور کے باعث ہے۔

سماج ہندی زبان کا لفظ ہے۔ اردو میں اس کے لیے معاشرہ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو کہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی اکٹھا رہنے کے ہیں۔ سماج کا انگریزی مترادف "سوسائٹی" Society ہے۔ سماج معاشرہ یا سوسائٹی انسانوں کے اس بڑے گروہ کو کہتے ہیں جو باہمی تعلق و تعامل کے اعتبار سے انفرادی خصوصیات کا حامل ہو۔

ویبسٹر نیو انگلش ڈکشنری کے مطابق:۔

> "People is general thought of as living together in organized communities with share law's traditions and values the people of a particular country area times etc. Thought of specially organized community people who are fashionable and wealth." (۲۵)

ترجمہ: مشترکہ قانون سازی کے ساتھ منظم برادری میں رہنے کے بارے میں عام طور پر لوگ اور کسی خاص ملک کے علاقے کے لوگوں کو ایک خاص ملک کے علاقوں کے اوقات کی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ خاص طور پر منظم جماعت کے لوگوں کے بارے میں جو فیشن ایبل اور دولت مند ہیں۔

انسان فطری طور پر حیوان ہے۔ انسان مل جل کر رہنا پسند کرتا ہے۔ انسان اکیلا زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ دوسرے انسانوں کے ساتھ ربط و تعلق رکھنا اس کی بنیادی ضرورت ہے اوراس کی مجبوری بھی ہے۔ یہی وجہ ہے انسان قبائل، گاؤں، کالونیوں، بستروں اور قصبوں میں رہنا پسند کرتا ہے۔ انسان کے رہنے کے لیے قوم قبیلہ اور خاندان تین اہم عناصر ہیں۔ اور عزیز رشتے داروں میں بالترتیب ماں، باپ اور بہن بھائی، عزیز و اقارب وغیرہ شامل ہیں۔

معاشرہ، انسان سے ہی بنتا ہے۔ معاشرہ اور انسان کا آپس میں گہرا تعلق ہے اور یہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ معاشرہ انسان پر بہت سے اثرات ڈالتا ہے۔ کیونکہ جب معاشرے کی تہذیب و ثقافت میں تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ اس لیے یہ بات آسانی سے کہی جاسکتی ہے کہ سماج کے بغیر انسان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ویسے ہی انسان کے بغیر بھی معاشرہ نہیں بن سکتا۔ انسان کے رویے، رجحانات ہی معاشرے میں تبدیلی لاتے ہیں۔

سماج اور فرد ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں۔ فرد سماج میں رہ کر ترقی کرتا ہے اور سماج کی ترقی افراد کے ذریعے ہوتی ہے سماج کی اکائی (Unit) فرد ہے۔ جو ہم ایک دوسرے کے ساتھ محبت رحم دوستی اور ہمدردی وغیرہ کے جذبات کو محسوس کرتے ہیں تب ہی سماجی رشتے بنتے ہیں۔ مثلاً سماجی، معاشی، ادبی اور اخلاقی وغیرہ اور یہی تمام رشتے مل جل کر ایک سماجی ماحول بناتے ہیں۔

سماج میں رہتے ہوئے بہت سے رشتوں کا سامنا ہوتا ہے جسے گھریلو یا علمی و ادبی اور سیاسی و معاشی رشتے مختلف طرح کے ہوتے ہیں۔ ہمارے لیے اہم بھی ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ رشتے دو یا دو سے زیادہ لوگوں کے درمیان بنتے ہیں سماج میں مندرجہ ذیل چار چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔

۱۔ عوام ۲۔ جماعت ۳۔ سکون ۴۔ ہمدردی

سماج کے لیے عوام پہلی ضرورت ہے۔ عوام سے سماج بنتا ہے۔ عوام کے بغیر سماج کی تخلیق ناممکن ہوتی ہے۔ سماج میں جماعت کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ سماج میں بھیڑ کا کوئی بھی نظام نہیں ہوتا ہے۔ سماج میں رہنے کے لیے سکون کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ جس سماج میں انتشار ہو ایسے ماحول میں کوئی سماج زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر پُر سکون سماج ہو گا تب ہی سماج ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔ انسان کے ہاتھ ہمدردی بھی بہت ضروری ہے۔ انسانی ہمدردی اور انسان کے ساتھ ہمدردی ہی ایک بہترین سماج بنا سکتے ہیں۔

لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ سماج دو یا دو افراد کا گروہ ہوتا ہے۔ معاشرہ مخصوص اصولوں اور آدرشوں، روایتوں میں بندھ کر بنتا ہے۔ اس میں رہن سہن، رسم و رواج اور دلچسپیوں میں مشابہت موجود ہوتی ہے۔ جو ہمارے مذہبی، اخلاقی، معاشی، علمی و ادبی اور اخلاقی رشتوں سے ملتا جلتا ہے۔

سماج لفظ سنسکرت زبان کے دو لفظوں سے مل کر بنا ہے۔ یہ لفظ ہیں "سم" اور "آج" سم کے معنی ہیں اکٹھا یا ایک ساتھ اور آج کے معنی ہیں۔ رہنا یعنی سماج کے لغوی معنی ہیں ایک ساتھ رہنا۔

درسی اردو لغت میں معاشرہ کی تعریف:

"مل جل کر رہنا، میل جول اور زندگی گزارنا۔"(۲۶) شان الحق حقی نے فرہنگِ تلفظ میں درج ذیل الفاظ میں معاشرے کی وضاحت کی ہے۔

"طریقِ زندگی، ساتھ مل جل کر رہنا۔"(۲۷) سماج کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ ہر سماج کا زندگی گزارنے کا انداز جداگانہ ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر سماج میں اعمال، افکار اور تجربات الگ الگ ہوتے ہیں۔ سماج ایک جامع چیز نہیں ہے بلکہ اس میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ مطلب یہ کہ سماج ہر زمانے میں مسلسل بدلتا رہتا ہے۔

"سماج بذات خود ایک عظیم اور وسیع ادارہ ہے۔ اور اس کے اتنے رنگ روپ ہیں کہ ان میں وحدت پانا مشکل ہے۔" (۲۸) سماج افراد کے گروہ کو کہا جاتا ہے جو آپس میں ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ مار کینسبرگ اس حوالے سے کچھ یوں لکھتے ہیں:

> "سماج افراد کا ایسا مجموعہ ہے۔ جو مخصوص تعلقات اور برتاؤ کے طریقوں میں بندھے ہوئے ہوتے ہیں اور اسی بنیاد پر ان دوسرے لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں جو ان تعلقات کو اختیار نہیں کرتے جو ان سے الگ ہیں۔" (۲۹)

گڈ نکس اور گینسبرگ اس بات پر متفق ہیں کہ سماج انسانوں کا ایک منظم گروہ ہے۔ جس کے اغراض و مقاصد میں افتراکات اور اشتراکات پائے جاتے ہیں۔

"افراد اور ان کے گروہ کے متعلق استعمال ہونے والا لفظ سماج ہے۔" (۳۰) معاشرتی عوامل، سماجی رویوں، معاشرتی اقدار اور روایات کو سماج نے اپنے اندر ضم کر لیا ہے۔ یہ انسان کے گروہوں کے آپس کے تعلق اور سرگرمیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ہم غور کریں تو ہمیں فرد کا تعلق معاشرے سے اور معاشرے کا تعلق فرد سے دکھائی دیتا ہے۔ فرد فرد پر اور معاشرے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ان تمام عوامل کے پس پردہ سماج ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر افضال بٹ سماج کو انسانوں کے باہمی تعلق و تعامل کا نام دیتے ہوئے کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> "سماج، معاشرہ یا سوسائٹی انسانوں کے اس بڑے گروہ کو کہتے ہیں جو باہمی تعلق و تعامل کے اعتبار سے انفرادی خصوصیات کا حامل ہو اس میں اقدار حیات اور ثقافت و تہذیب کے ساتھ ساتھ ذہنی، روحانی اور نظریاتی اختصاص اس طرح پر موجود ہو تو اسے دیگر مشابہ گروہوں سے ممتاز کرے نیز جذباتی و احساسی اور شعوری و غیر شعوری سطح پر اس کی وحدتی کڑیاں منضبط ہوں۔" (۳۱)

اب تک سماج کی کوئی مکمل تعریف نہیں کی گئی سماج کے ماہرین نے Sociologist نے اپنی اپنی رائے قائم کی ہے۔ سماج کے لیے سماجی رشتوں کا ہونا ضروری ہے اور سماجی رشتوں کے نظام کو ہی سماج کہتے ہیں۔

انسان کی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی جس وقت پیدائش ہوئی سب سے پہلے اسے تین مادی چیزوں کی ضرورت پیش آئی۔ پہلی کھانے کی، دوسری سر چھپانے کی اور تیسری تن ڈھانکنے کی۔ انسان کے ابتدا میں اپنی بھوک کو مٹانے کے لیے جنگلی پھلوں سے بھوک مٹاتا رہا۔ درختوں کے پتوں سے اپنے جسم کو ڈھانپا کرتا تھا اور سر چھپانے کے لیے درختوں کی شاخوں پر اپنے گھر بنائے تاکہ وہ جنگلی جانوروں سے خود کو محفوظ رکھ سکے۔ انسان پیٹ بھرنے کے لیے جنگلی جانوروں کا شکار بھی کرتا تھا۔ ہر کوئی خود اپنی غذا کا انتظام کرتا تھا کیونکہ اس وقت ہمدردی کا جذبہ پیدا نہیں ہوا تھا اور انسان نے پھر غاروں میں رہنا شروع کر دیا۔

آہستہ آہستہ جب انسانوں نے پتھروں کی مدد سے انکار کیا تو اسے شکار کو اپنی رہائش گاہ بنانے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ اس فکر سے دوسری ضرورتیں کے فکر میں سب کو ایک دوسرے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اس وقت انسان کو سماج کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ضروریات انسانی ایک دوسرے کو قریب کر دیا۔ جس کی وجہ سے انسان ایک دوسرے کی مدد کرنے لگا ہے۔ جس سے اس کی ضرورتیں پوری ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے محبت پیار اور ہمدردی کا جذبہ بھی پیدا ہو گیا ہے۔ اب اگر کوئی ایک شخص شکار کر کے لاتا سب اُس سے بھوک کو مٹاتے ہیں۔ اس طرح انسان نے اب قبیلوں کی صورت میں رہنا شروع کر دیا۔ پھر پتھروں کی مدد سے آگ جلاؤ لباس کی شکل میں پہلے درختوں کے پتے پھر چمڑے کا استعمال کیا۔

پتھروں اور لکڑیوں سے ہتھیار بنانے اور کاشت کاری کرنا شروع کر دی۔ ابتدا میں انسانی تاریخ میں سب سے پہلے کاشت کاری کی گئی۔ کاشت کی حفاظت کرنے اور ضروریات کو مکمل کرنے کے لیے انسان کو باہمی میل جول کی ضرورت پڑی۔ جس سے انسان نے سماج کی بنیاد رکھی اور پھر آس پاس مٹی کے گھر بنائے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں انسان نے اپنی ضروریات کی بنا پر ہی سماج کا وجود سامنے آیا۔

ابتدائے آفرینش سے ہی انسان دوسرے انسانوں کا کسی نہ کسی حوالے سے محتاج رہا ہے۔ نوزائید گی کی عمر سے لے کر وفات تک ہر انسان معاشرے میں انسانوں کی بدولت ہی اپنی جملہ ضروریات کو پورا کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ اسی ضرورت نے اُسے ایک سماج کو تشکیل دینے میں مدد دی۔ رفتہ رفتہ جب انسان پوری دنیا

میں پھیل گئے تو موسم اور جغرافیائی تنوع کے پیشِ نظر ان کے لباس اور معاشرت میں تبدیلی رونما ہوئی۔ انسان نے اپنی ضرورت کے پیشِ نظر چیزوں کو نام دینا شروع کیے اور اسی طرح ایک زبان معاشرے کے اندر بستی چلی گئی۔ دنیا کی مختلف زبانوں نے جہاں ذخیرہ معلومات پائی جاتی ہیں۔ وہیں ایک زبان میں انسان اپنے احساسات، جذبات اور علم کی بدولت مختلف حالات کو سمجھنے، قلمبند کرنے کا سلیقہ سیکھ چکا ہے۔ جوں جوں انسانی آبادی نے ترقی کی معلومات، احساسات اور تجربات سے بھرپور کہانیاں تخلیق پاتی چلی گئیں جس نے ایک انسان کو دوسری نسل کے ساتھ نہ صرف جوڑے رکھا بلکہ اپنی علمی وسعت کے بدلے ان کے تجربے میں اضافہ کرنے میں پوری مدد کی شاعری ہو یا نثر ادب کے دونوں سرچشمے انسانی تجربات اور احساسات کے بیان سے بھرپور ہے۔ ادب کسی بھی زبان یا معاشرے کی سو فیصد درست عکاسی کرتا ہے بلکہ شاعر اور ادیب چونکہ عام انسانوں کی نسبت زیادہ فہم و ادراک رکھتے ہیں۔

اس لیے اکثر ادیب یا شاعر وجدانی حالت میں پیش حالات کو درست بیان کرنے میں مل کر رہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں۔ ادب سماج سے ہوا ایک ایسا جوہر ہے جس میں معاشرے میں موجود تمام اجزا پائے جاتے ہیں اگر کسی سبب معاشرے کے رجحانات میں تبدیلی رونما ہوتی ہے تو ادب ایسا پیمانہ جو سب سے پہلے آنے والے طوفان کی خبر دیتا ہے۔

گزشتہ دو صدیوں کے دوران سائنس میں ہونے والی پیش رفت اور مواصلاتی ذرائع کی برق رفتاری کو صحیح معنوں میں ایک گلوبل ویلج بناتی ہے اسی وجہ سے دنیا کے حالات مجموعی طور پر ہر زبان پر اثر انداز ہوتے ہیں لیکن معاشرتی فرق کی وجہ سے دنیا کے تمام ادیبان حالات و واقعات کو اپنے نقطہ نظر کے مطابق تشکیل دے کر لکھتے ہیں۔

ادب اور سماج کا تعلق سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ادب پر عہد کے ظاہر و باطن کا عکس ہوتا ہے۔ جو کچھ اس عہد میں وقوع پذیر ہو رہا ہوتا ہے۔ ادیب ان سب کو اپنی تحریروں میں سمو رہا ہوتا ہے۔ ادب کو زندگی اور معاشرے کا حساس ترجمان کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا۔ کیونکہ ادب ہی ہے جو اس کے مدوجزر اور طوفان کو

احساسات، جذبات اور حساسیت سے ہمارے دلوں تک پہنچتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں وہ براہ راست ادب سماجی، سیاسی معاشی زندگی سے متاثر ہوتا جس طرح دوسرے اعمال و افعال۔ اور یہ حقیقت ہے شاعر یا ادیب جو کچھ بھی تخلیق کرتا ہے اس میں داخلی کیفیات اور اندرونی کسک خلش اور کشمکش کا سبب زیادہ دخل ہوتا ہے۔ لیکن اس کیفیت کا سبب خارجی حالات و واقعات ہوتے ہیں۔ جب حالات و واقعات میں تبدیلی آتی ہے تو اسی طرح ادب بھی ترقی کی راہ پر چلنا شروع کر دیتا ہے۔ دراصل ادب میں سماجی، سیاسی اور معاشی حقائق کا اہم کردار ہے اور اردو ادب میں تمام موضوعات انہی حقائق کے تناظر میں جنم لے رہے ہیں۔

ڈاکٹر نذیر تبسم اس بارے میں لکھتے ہیں:

> "بنیادی طور پر ادب ہی وہ آئینہ ہے جو کسی زمانے کو سیاسی، معاشی اور معاشرتی اقدار اور روایات کے تناظر میں منعکس کرتا ہے اور مجموعی رویوں کا احساس دلا کر ثقافت عصر کے خدوخال بھی نمایاں کرتا ہے۔" (۳۲)

معاشرے کے ادیب کی نظر خارجی اور داخلی دونوں پہلوؤں پر ہوتی ہے۔ وہ ان پہلوؤں کو بھی سامنے لاتا ہے۔ جو ایک عام فرد کی نظر سے اوجھل ہوتے ہیں۔ الفاظ کو ایک ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچانے کا ذریعہ ایک ادیب ہی ہوتا۔ ادیب عہد کا مصور ہوتا ہے اس کی تحریریں اپنے عہد کا مکمل احاطہ کرتی ہیں۔

ادیب تخلیقات کے ذریعے ہی ایک عہد کے سیاسی و سماجی صورت حال علم و دانش اور اندازِ فکر کو دوسرے عہد تک پہنچاتا ہے۔ ادب کا تعلق سماج سے بہت گہرا ہے۔ یہ بات غلط نہیں کہی جا سکتی کہ ادب معاشرے کا ردعمل ہوتا ہے۔ بعض اوقات فنکار زندگی کے مسائل اور معاشرتی قدروں کے قائل نہ ہوتے ہوں لیکن نہ جانتے ہوئے وہ اپنی ذات سے تعلق رکھنے والے معاشرے کی عکاسی ضرور کرتا ہے۔ ہر دور میں ادب کی سرپرستی مختلف طبقوں کے ہاتھوں میں ہوتی تھی، جس سے ادب کی تکنیک اور اندازِ بیاں میں فرق آجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر معاشرے کا ادب الگ ہوتا ہے بلکہ اس کی خاص روایات بھی قائم ہو جاتی ہیں۔ ادبی تخلیقات میں احساسات و جذبات کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ یہ عناصر سماجی اثرات سے بچ نہیں سکتے یہی وجہ ہے کہ فنکارِ ادب کو سماجی قدروں کی ایک قوت اور اس کے مظہر کے طور پر ہی اس دیکھنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ ادبی سماجیات کا بھی اپنا اہم منصب ہوتا ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

پروفیسر محمد حسن اس بارے میں لکھتے ہیں:

"ادبی سماجیات کے بغیر ادب کی تکمیل کا احساس و ادراک ممکن نہیں کم سے کم اس کے ایک پہلو سے محرومی لازمی ہو گی۔" (۳۳)

یہ ادب اپنے عہد کا عکس ہوتا ہے۔ ادیب جس معاشرے میں رہ رہا ہوتا ہے اُسے اس معاشرے کی تمام ضروریات اور وہاں پر ہونے والے حادثات و واقعات سے متاثر ہوتا ہے۔ وہ جن لوگوں کے ساتھ گزر بسر کر رہا ہوتا ہے۔ جن خیالات و روایات کا حامل ہوتا ہے وہ یقیناً اس کے احساسات و جذبات کو متاثر کرتے ہوں گے اور جب احساسات و واقعات لوگوں کے دلوں کی دھڑکا دیتے ہیں وہی ادب پر بھی ہوتا ہے۔ ادب میں تاثر اُسی وقت ہو سکتا ہے۔ جو حقائق زندگی کے قریب اور زندگی آئینہ ہوں ادب کے لیے محض آئینہ ہونا ہی کافی نہیں ہوتا۔ ادب اچھائی اور برائی کے بارے میں نہیں بتاتا ہے بلکہ اس میں اصول و ضوابط کے بارے میں آگہی ہو۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ ادب سماج کا ہی عکس ہوتا ہے۔

بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

"ادب اپنے زمانے کے شعور کو آنے والے زمانے کے شعور سے ملا کر برسوں بعد بھی اس طرح متاثر کرتا رہتا ہے۔ ادب اس شعور، آگہی اور روح کا اظہار ہے جو اپنے زمانے میں معنی کی تہہ کو کھولتا ہے۔ اور آنے والے زمانے میں تہہ کو کھولتا ہے اور زمانہ جب وقت کی مسافت طے کر کے مستقبل کی منزل کو چھوتا ہے تو ادب پارے کا سورج اپنی تمازت و روشنی سے اسے منور کر دیتا ہے۔" (۳۴)

ادب کو علم و خیال کا مجموعہ انسانی سماج کا دماغ کہا جاتا ہے۔ ادب کا تعلق ہر شعبہ ہے۔ ادب انسانی ذہن کی تاریخ ہوتا ہے۔ ادب و فن کا وہ شاہکار ہوتا ہے جو کہ ابدی ہے:

"ادب ہر زمانے میں زندہ رہتا ہے وہ اپنے رخ تو بدلتا ہے مگر زندگی کے اصل دھارے سے الگ نہیں ہوتا، یہ دھارے انسانی زندگی اور سماج کے بیچ سے پھوٹتے ہیں ادب زندگی کی دوڑ میں انسانوں کا آلہ کار بھی بنتا ہے اور ان کی جدوجہد کا گراف بھی۔" (۳۵)

ادب کو زندگی کی تنقید کہا جاتا ہے۔ زندگی کی حقیقت اس کی مختلف صورتوں، زندگی اور سماج کے تعلق، زندگی بسر کرنے کے مختلف طریقے رہے ہیں اقتصادی اور مادی ترقی، طبقاتی سماج، سیاست اور اس کی ضرورت آرٹ کلچر، مذہب، آغاز سے ابد تک انسانی فسادات اور ان کے خونی نتائج، قوموں کے عروج وزوال کی کہانی اور حادثات وانقلاب شامل ہیں۔ اس لیے ادب کو سماج کا آئینہ قرار دیا گیا ہے۔ اگر سماج وجود میں نہ ہوتا تو ادب بھی سامنے نہ آتا۔ سماج میں ہونے والی ترقی اور منزل کا اندازہ ہم اس کے ادب کو پڑھ کر لگا سکتے ہیں۔ سماج تغیر پذیر ہوتا ہے یہ بھی زندگی کی طرح متحرک ہوتا ہے۔ ہمیشہ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اسی لیے ادب میں بھی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ زندگی ایک منزل پر آکر نہیں رک جاتی۔ کبھی ترقی کی طرف گامزن ہوتی اور کبھی مائل نہ زوال۔ ان تمام تبدیلیوں سے ادب کو بھی دوچار ہونا پڑتا ہے کیونکہ جب زندگی اپنی کروٹ بدلتی ہے تو لازم ہے سماج بھی اس انداز سے بدل جاتا ہے۔

ڈاکٹر سید محمد عقیل کہتے ہیں:

> ”عہد عتیق سے لے کر آج تک کے ادب پر جب ہم ایک نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہر دور میں انساں اور اس کی معاشرت، ماحول کے لحاظ سے اس کے ادب میں بھی مختلف کروٹیں لیتی رہتی ہیں۔ کوئی دور ایسا نہیں گزرا جب انسانی تاریخ انسانی ادب پر اثر انداز نہ ہوئی ہو۔ کسی بھی زمانے کا ادب اس دور کے انسانی تحریکات، خیالات اور نظریات کی عکاسی خالی نہیں دیا۔ انسان نے جب بھی اپنے خیالات کو رواج دینا چاہا اپنی الجھنوں کا تذکرہ کیا تو وہ ادب میں شامل کر لیا گیا۔ وہ دور جب انسان نے پڑھنا لکھنا سکھا یا پھر وہ تصویری دور جب وہ اپنے جذبات وخیالات کی ترجمانی تصویریں بنا کر کیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی ادب میں انسانی ضروریات سماجی کشمکش اور اس کے جذبات کا اظہار ہوا کرتا ہے۔“ (۳۶)

ادب ایک سماجی فرد کی طرح ہے جو جس طرح کے سماج میں رہتا ہے وہاں کے اثرات کو اُسی طرح قبول کر لیتا ہے اور ادب کی تخلیق بھی پھر ویسی ہی ہوتی ہے۔ اس بات سے انکار کرنا ناممکن ہے کہ ادب اور سماج ایک سکہ کے دو پہلو ہیں اور دونوں کے دوسرے واضح اثرات موجود ہوتے ہیں۔ جب سماج میں بہت زیادہ برائیاں ہونے لگیں تو اس سے سماج کا معیار گرنا شروع ہو جاتا ہے۔ تو ادب سماج کی ہو بہو تصویر کشی نہیں بلکہ ادب سماج کے اخلاقی معیار بلند کرتا ہے۔ اور ایک روشن مستقبل کی امید دلاتا ہے۔

سجاد ظہیر اپنی کتاب "روشنائی" کچھ یوں کہتے ہیں:

"ادب زند گی کا آئینہ ہے یہی نہیں وہ کاروانِ حیات کا رہبر بھی ہے اُسے محض زندگی کی ہم رکابی نہیں کرنا بلکہ اس کی رہنمائی بھی کر نا ہے۔"(۳۷)

ادب کی طرح سماج کو بھی ادب کا نقاد کہا جاتا ہے۔ جس کا کام وقت بے وقت ادب کی تنقید کرنا ہوتا ہے۔ جب کبھی ادب اپنے معیار پنجے گرنے لگتا ہے تو سماج اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا۔ وہ ادب کے معیار کو بلند کر دینا ہے لیکن ان میں سب سے اہم چیز سیاست ہے۔ کسی ملک کا سیاسی نظام جیسا ہو گا اس کے مطابق ہی وہاں کے عوام کی زندگی ہو گی۔ اور وہی عکس ہمیں سماج میں دیکھنے کو ملے گا۔

اس باب میں سفر نامہ اور اس کے فن طنز و مزاح اور سفر ناموں کے بارے میں صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔ سفر نامہ ادب کی ایک ایسی صنف ہے جس میں ادب کی دیگر اصناف کا استعمال ہوتا ہے۔ غزل کا مشاہدہ نظم اور مثنوی کی طوالت، ڈرامے کی ڈرامائیت اور شاعری سے طنز اور ظرافت اس میں شامل ہو جائے گی۔ اسی طرح مکالمے اور لمبے اور خوبصورت فقرات اسے انشاء پر دازی کا شاہکار بنا دیتے ہیں ۔یوں تو سفر انسانی تجربے اور مشاہدے میں اضافے کا سبب بنتا ہے مگر سفر نامہ اصل میں داستان سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے کیونکہ داستانوں میں سفر نامے کے عناصر سب سے زیادہ پائے جاتے ہیں اس لیے زیادی تر داستا نیں بادشاہوں اور شہزادوں کے سفر ناموں پر ہی بحث کرتی ہیں جس میں ان کو مختلف قسم کے تجربات حاصل ہوتے ہیں۔ سفر در اصل انسان کو دنیا کی تصویر کا حوصلہ دیتا ہے اور دوسری جانب اس کی متلون مزاج فطرت کی تسکین کا بھی باعث بنتا ہے۔

جدید سفر نامے میں سفری روداد کے ساتھ ساتھ لوگوں کی عادات وخصائل اور بود وباش کے طریقوں کو دیکھا اور پر کھا جاتا ہے کیونکہ جب کوئی سفر نامہ نگار سفر نامہ لکھنے کا فیصلہ کرتا ہے تو تہذیب اور بود وباش کی یکساں پہلو اس کی نظروں سے پوشیدہ رہتے ہیں مگر مختلف چیزیں اور اُمور اس کی توجہ کا سبب بنتی ہیں۔ چنانچہ جب کوئی قاری کسی سفر نامہ نگار کا سفر نامہ پڑھتا ہے تو اس کے لکھنے سے صرف وہی مطلب اخذ نہیں کرتا جو سفر نامہ نویس نے بیان کیا ہوتا ہے بلکہ اکثر اوقات وہ سفر نامہ نگار کی زندگی ذہنی صلاحیت اور اس کے بیان کردہ حوالوں سے

مزید کئی طرح کے نتائج اخذ کر کے اپنے تجربے میں مزید اضافہ کر سکتا ہے مثلاً سفر نامہ سے سفر نامے کے مطالعے سے مصنف کی ذہنی ساخت، مزاج اور سوچ کا مطالعہ، مصنف کے بیان کردہ نکات سے اس کے بیانیہ کے علاوہ نتائج اخذ کرنا اور یہ کہ اپنا نقطہ نظر اخذ کرنا وغیرہ۔ یوں قاری بیک وقت تین مختلف کیفیات سے گزرتا ہے جو اس کی مسرت اور خوشی کا باعث بنتے ہیں۔

تخلیقی ادب کے دو اہم عناصر طنز و مزاح ہیں جو ادب کے تمام شعبوں میں موجود ہیں۔ سفر نامے میں طنز و مزاح کی مدد سے اُن سماجی عناصر اور تہذیبی رویوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس کا بیان سیدھی اور سپاٹ زبان میں ممکن نہیں کیونکہ سیدھی اور سپاٹ زبان ان عناصر کو بیان کرنے میں ناکام ثابت ہوتی ہے جس کے لیے طنز و مزاح کے اصول مروج کیے گئے ہیں جیسا کہ ابتدا میں بیان کیا گیا ہے کہ انسان ہمیشہ سے تبدیلی پسند واقع ہوا ہے اور اپنے ذوق کی تسکین کے اُسے کئی طرح کے کام کرنے پڑتے ہیں۔ ہر انسان کی سوچ دوسرے انسان سے مختلف ہوتی ہے اسی وجہ سے ایک دوسرے پر تنقید کرنا اور مضحکہ اڑانے جیسے عوامل انسانی معاشرے میں ابتدا ہی سے موجود ہیں۔ طنز و مزاح در اصل اُس ٹھٹھے اور مزاح کی ترقی یافتہ اور تہذیب یافتہ شکل ہے جسے تخلیقی ادب میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

سماج انسانوں کا ایسا مجموعہ کہلاتا ہے جس میں ایک دوسرے کی مدد سے ضروریات پوری کرتے ہیں۔ سماجی نظام میں روایات بنتی ہیں اور وقت کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ اس لیے روایات سے بندھے ہوئے انسان کے لیے ان حدود کو پار کرنا ان کی خلاف ورزی کرنا ممکن ہے کیونکہ ان روایات کے بننے میں جتنا وقت صرف ہوتا ہے جس قدر عالی دماغ ان کو تشکیل دیتے ہیں ان سے فرار حاصل کر کے رہتا ہے۔ ایک عام انسان کے لیے قطعاً نا ممکن ہوتا ہے۔ ادب کا مطالعہ ان سماجی روایات زبان اور رویوں کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے جن کے لیے وہ تشکیل دی جاتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفر نامہ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۴۸

۲۔ English to English and Urdu Dictionary, Lahore Feroz Sons, 2005

Pg: 195

۳۔ مولوی فیروز الدین، فیروز اللغات، اردو جامع فیروز سنز، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۲۸۳

۴۔ شان الحق حقی، مولف فرہنگ تلفظ، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۵۹۳

۵۔ نفیسہ حق، سفر نامہ، فن اور جواز مشمولہ سہ ماہی ازبیر سفر نامہ، شمارہ نمبر ۲، اردو اکادمی، ۱۹۹۸ء، ص ۳۶۔۳۷

۶۔ قدسیہ قریشی، ڈاکٹر، اردو سفر نامے انیسویں صدی میں جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۲۴

۷۔ خالد محمود، ڈاکٹر، اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ، دریا گنج، نئی دہلی، ۱۹۹۵ء، ص ۲۲

۸۔ ذوالفقار علی احسن، اردو سفر نامے میں جنس نگاری کا رجحان، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ص ۶۵

۹۔ سورت العنکبوت، آیت نمبر ۲۰، پارہ نمبر ۲۱۔۲۲

۱۰۔ یوسف خان، کمبل پوش، تاریخ یوسفی، عجائبات فرہنگ مقدمہ، نیو انڈیا آف اسٹیٹ پریس، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۲۳

۱۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفر نامہ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۱۲۵

۱۲۔ خالد محمود، ڈاکٹر، اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ، دریا گنج، نئی دہلی، ۱۹۹۵ء، ص ۴۴

۱۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفر نامہ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہو، ۱۹۸۷ء، ص ۱۱۴

۱۴۔ ایضاً، ص ۶۰

۱۵۔ اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، اردو نثر میں طنز و مزاح، بیت الحکمت، نئی دہلی، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۲۸

۱۶۔ محمد طفیل، طنز و مزاح، مشمولہ ادارہ فروغ اردو،، لاہور، ۱۹۵۰ء ص ۵۱

۱۷۔ سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، طنز و مزاح کے نظریاتی مباحث اور کلاسیکی شاعری، مقالہ برائے پی۔ ایچ ڈی، لاہور، ۱۹۵۷ء، ص ۴

۱۸۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو ادب میں طنز و مزاح،، مکتبہ عالیہ، نیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۰ء، ص ۴۹

۱۹۔ مشتاق احمد یوسفی، خاکم بدہن ادبی دنیا، اردو بازار، دہلی، اپریل ۱۹۳۷ء، ص ۹۳

۲۰۔ مشتاق احمد یوسفی، آب گم، حرم پریس، کراچی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۴

۲۱۔ مشتاق احمد یوسفی، چراغ تلے، حسامی بک ڈپو، حیدر آباد، ۱۹۸۴ء، ص ۱۱

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۱۷

۲۳۔ فرہنگ آصیفہ، مرتبہ مولوی سید احمد دہلوی، جلد سوئم اردو سائنس بورڈ، اشاعت اول، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۳۷۹

۲۴۔ مشتاق احمد یوسفی، زرگزشت (دیباچہ)، عبداللہ ہارون روڈ،، کراچی، اشاعت دوم، ۱۹۷۷ء، ص ۱۳

۲۵۔ Webster's New illustration dictionary Allama's Frederiek Kullen Reinst, Books, Ink Publishers New York Washington D.C, 1970

۲۶۔ مولوی فیروز الدین، فیروز اللغات، اردو جامع فیروز سنز، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۳۸۹

۲۷۔ شان الحق حقی، مولف فرہنگ تلفظ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۵۹۳

۲۸۔ نگینہ جبیں، اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد، ۱۳۰۵اے دریا آباد، آلہ آباد، دسمبر ۲۰۰۳ء، ص ۲

۲۹۔ ایضاً، ص ۴

۳۰۔ ایضاً، ص ۲

۳۱۔ محمد افضال بٹ، ڈاکٹر، اردو ناول میں سماجی شعور (طبع اول) پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۱۲

۳۲۔ نذیر تبسم، ڈاکٹر، پنجاب سندھ اور سرحد کی غزل کا موضوعاتی تقابل (قیام پاکستان کے بعد)، مشمولہ دریافت، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد، شمارہ ۸، ص ۲۱۱

۳۳۔ محمد حسن، پروفیسر، ادبی سماجیات، مشمولہ عصری ادب، جولائی تا اکتوبر ۱۹۸۳ء، دہلی، ص ۱۴۰

۳۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، نئی تنقید، مرتبہ خاور جمیل، رائل بک کمپنی، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۲۸۴

۳۵۔ نگینہ جبیں، اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ، ۱۹۴۷ء اس کے بعد، ۱۴۰۵اے دریا آباد، آلہ آباد، دسمبر ۲۰۰۲ء، ص ۱۳

۳۶۔ ایضاً، ص ۱۲

۳۷۔ ایضاً، ص ۱۳

باب دوم:

عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں سماجی طنز کا فکری پہلو

طنز و مزاح دنیائے ادب کا ایک مشکل ترین شعبہ ہے۔ اس بات کی تصدیق کے لیے کسی زبان کے بڑے سے بڑے ادب کو اٹھا کر دیکھیں تو اس میں اعلیٰ پائے کے مزاح خال خال ملیں گے۔ دنیا بھر کے ادب میں ہمیں مزاح نگار آٹے کے نمک کے برابر نظر آتے ہیں۔ یہ اردو ادب کی خوش قسمتی ہے کہ بیسویں صدی میں اردو ادب کے آسمان پر مزاح نگاروں کی کہکشاں دکھائی دیتی ہیں۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں اکبر الہ آبادی، پطرس بخاری، فرحت اللہ بیگ، انجم مانپوری، رشید احمد صدیقی، چغتائی، شوکت تھانوی، امتیاز علی تاج، فرقت کاکوروی اور شفیق الرحمٰن کے فن کے چراغ روشن ہوئے۔ اور نصفِ آخر میں دیکھیں تو محمد خالد اختر، مشتاق احمد یوسفی، کرنل محمد خان، یوسف ناظم، سید ضمیر جعفری، دلاور فگار، ابنِ انشاء، صدیق سالک، فکر تونسوی، مجتبیٰ حسین، دلیپ سنگھ، پروفیسر عنایت علی خاں، انور مسعود اور عطاء الحق قاسمی کے ہنر کا اجالا دکھائی دیتا ہے۔

سفر نامہ اردو ادب کی مقبول ترین اصناف میں سے ہے۔ یہ صنف تھوڑے ہی عرصے میں مقبول ہوئی۔ شروع میں سفر نامہ میں تاریخی مقامات کا تعارف اور قارئین کے لیے ایک معلوماتی کتابچے کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ اس نے اپنی اور ارتقائی منازل سرعت سے طے کرتے ہوئے ایک مقبول صنفِ ادب کی صورت اختیار کرلی۔ آج ہمارے ادیب بے شمار اس صنفِ سخن کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ اردو سفر نامے کی صنف کو اعتبار بخشنے والے اہلِ قلم میں یوسف خان کمبل پوش، محمود نظامی، ابنِ انشا، بیگم اختر ریاض الدین، مستنصر حسین تارڑ، شفیق الرحمٰن، محمد خالد اختر اور عطاء الحق قاسمی کے اہم نام ہیں۔

عطاء الحق سفر ناموں میں محب وطن اور مزاح نگار ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ مغربی رنگینیوں کو مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ اور وہ ان سے استفادہ کرتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں ان کے اس استفادہ سے زیریں سطح پر مشرقی رنگ دکھائی دیتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی ان سب کو تماشائی کے طور پر

دیکھتے ہیں مگر وہ تماشے کا حصہ نہیں بلکہ اپنی اقدار اور روایات کو اپنے پاؤں کی زنجیر سے جدا نہیں ہونے دیتے۔ عطاء الحق قاسمی کے یہ سفر نامے تکنیک کے اعتبار انیس بیس کے فرق کے ساتھ یکساں نوعیت کے حامل ہیں۔ ان کے سفر ناموں میں چھوٹے چھوٹے عنوانات موجود ہیں اور وہ مختلف کرداروں اور واقعات کے تانے بانے سے ان چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو رنگینی عطا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کی رائے ہے:

> "قاسمی ایک بے قرار روح ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے یہاں ایک کھلنڈرا پن بھی ہے۔ اس کے سفر ناموں میں شوخی اور شرارت کے عناصر قابلِ لحاظ تعداد میں مل جاتے ہیں۔ لیکن اس شوخی اور شرارت کی تہہ میں کہیں کہیں جو گداز کی ہلکی ہلکی موج ہلکورے لیتی ہے، اسے بھی نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔"(۱)

عطاء الحق قاسمی کا پہلا سفر نامہ جو کہ احمد ندیم قاسمی نے اپنے مجلہ "فنون" میں قسط وار شائع کیا۔ جس کی وجہ سے انہیں بہت شہرت حاصل ہوئی۔ عطاء الحق قاسمی نے یہ سفر نامہ ستائیس سال کی عمر میں تحریر کیا۔ جب آپ امریکہ ۱۹۷۰ء میں واپس آئے تھے۔ یہ پہلے کتابی صورت میں شائع نہیں ہوا تھا بلکہ لاہور سے قسط وار فنون میں شائع ہوتا رہا۔ مشوقِ آوارگی کے بارے میں منظور الٰہی یوں بیان کرتے ہیں:

> "عطاء الحق قاسمی کا "شوق آوارگی" ۱۹۷۳ء سے قبل نیویارک اور یورپ کا سفر نامہ ہے۔ جسکا کچھ حصہ ماہ نامہ "فنون" لاہور کے مختلف شماروں میں نو اقساط میں شائع ہوا۔ اور تا حال یہ رودادِ سفر مکمل نہیں ہوئی اور نہ ہی ابھی کتابی شکل میں طبع ہوئی ہے۔ یہ سفر نامہ ابھی کتابی شکل شائع نہ ہونے کے باوجود فنون کے اوراق میں خاصی مقبولیت حاصل کر چکا۔"(۲)

عطاء الحق قاسمی کا یہ سفر نامہ قسط وار چھپنے سے اس کو مقبولیت حاصل ہوئی اور عطاء الحق قاسمی کو اپنے پہلے ادبی کارنامے اس کی شہرت میں اور اضافہ ہوا۔ عطاء الحق قاسمی کے اس سفر نامے میں شوخی ظرافت پند و نصائح،

طنز و تعریفیں کا مرقع بھی نظر آتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی کا اس سفر نامے میں اسلوب کمال کا ہے۔ ان کے جملوں میں شوخی اور چٹخارہ ہے جو قاری کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔

گوروں کے دیس میں اس سفر نامہ میں عطاء الحق قاسمی برطانیہ کی سفر بیتی بیان کرتے ہیں۔ اس سفر نامہ میں عطاء الحق قاسمی کے اس میں فرانس، جرمنی، ہالینڈ، ڈنمارک، سویڈن اور ناروے کے قصے بیان کرتے ملتے ہیں۔ ان کے اس سفر میں ان کے ساتھ امجد اسلام امجد، حسن رضوی اور خالد احمد بھی عطاء الحق قاسمی کے ہمراہ تھے۔ ان کا یہ سفر نامہ دوستوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ، جملے بازی اور شرارتوں کا مرقع نظر آتا ہے۔ اس سفر نامے کو دوسرے سفر ناموں سے انفرادیت حاصل ہے۔

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک لکھتے ہیں:

> "یہ سفر نامہ عطاء الحق قاسمی کے مخصوص اسلوب کا آئینہ دار ہے۔ لیکن اس میں شوق آوارگی کی سی وارفتگی اور بے ساختی کم کم ہی نظر آتی ہے۔ جس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ یہ سفر نامہ ۲۷ سالہ عطاء الحق قاسمی کی بجائے ۴۷ سالہ عطاء الحق قاسمی نے کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن مناظر یہ، وہ شوق آوارگی میں واہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں بالکل ویسے ہی مناظر سامنے آنے پر ان کے ہاں "آہ" کی آواز سنائی دیتی ہے۔"(۳)

اس سفر نامے میں عطاء الحق قاسمی نے ایک سچے محب وطن کے طور پر نظر بھی آتے ہیں اور وہ اس معاشرے کے ساتھ ساتھ پاکستانیوں کو وہاں کے عیوب سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔

"دلی دوراست" میں عطاء الحق قاسمی بھارت کے دوروں پر مشتمل ہے۔ انھوں نے پہلا دور ۱۹۷۷ء میں ایک زائر کے طور پر کیا۔ جبکہ دوسرا دور ۱۹۸۵ء میں حیدر آباد دکن میں ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس، طنز و مزاح میں شرکت کی غرض سے کیا۔ عطاء الحق قاسمی اس سفر نامے میں ہمیں شاعروں کی تقاریب عشائیے، دیگر عورتوں کی تفصیلات اور مختلف مقامات کی سیر کرواتے ہیں۔ اس سفر نامے میں بھارت کے احوال سے آگاہ کیا۔ دلی دوراست ۱۹۹۵ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ عطاء الحق قاسمی کا تیسرا سفر نامہ ہے۔ لیکن اس حوالے سے محمد خاور نوازش ان کے اس سفر نامہ کو عطاء الحق قاسمی کا دوسرا سفر نامہ قرار دیتے ہیں۔

"دلی دوراست گو کہ مکمل کتابی صورت میں "گوروں کے دیس میں" کے بعد اشاعت پذیر ہوئی لیکن یہ سفر نامہ انھوں نے پہلے اختیار کیا تھا۔ اور اس کا ایک حصہ بھی پہلے شائع ہو چکا تھا۔ اس لیے زمانی ترتیب میں یہ ان کا دوسرا سفر نامہ ہے۔"(۴)

عطاء الحق کا سفر نامہ مختلف زمانوں کے دور دوروں پر مشتمل ہے۔ یہ دونوں مختلف مقاصد کے لیے کیے گئے۔

"دلی دوراست" کا پہلا حصہ خواب اور حقیقت کے درمیان پہلا سفر کے عنوان سے ہے۔ یہ سرہند کے سفر کی روداد ہے۔ جو انھوں نے ۱۹۷۷ء میں مجدد الف ثانی کے سالانہ عرس کی تقریبات میں شرکت کی۔ دوسرا سفر ۱۹۸۵ء میں حیدر آباد دکن کا ہے۔ اس سفر کرنے کا مقصد حیدر آباد دکن میں ہونے والی کانفرنس عالمی طنز و مزاح میں پاکستانی ہونے کی حیثیت سے نمائندگی کرتا تھا۔ موخر الذکر دل پھر کوئے ملامت کو جائے ہے۔ سفر کی روداد کے عنوان سے دلی دوراست میں شامل ہے۔ سافتیں کے نام سے شائع ہوتا رہا ہے۔ جہانگیر بک ڈپو لاہور سے پہلی بار ۱۹۹۵ء میں مکمل سفر نامہ کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔ ۲۰۱۰ء میں تازہ ایڈیشن نستعلیق مطبوعات لاہور نے شائع کیا۔ اس سفر نامے میں طنز و مزاح بھی ہے۔ سیاسی گفتگو بھی، تقریب کا احوال بھی، واقعات کا ذکر بھی احسن انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ شب و روز کی بھارتیوں کے رویوں کا ذکر بھی موجود ہے۔ ان کی دونوں حصوں کی تصنیف میں زمانی فیصلہ پایا جاتا ہے۔ اس لیے ہمیں مصنف کے مشاہدات، تاثرات میں واضح فرق نظر آتا ہے۔

شوقِ آوارگی سے دنیا خوبصورت تک آتے آتے یہ محسوس ہوتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے پوری دنیا کو گھومنے کے ساتھ ایک سفر اپنی ذات کے اندر بھی کیا جس کا قدم جذبات نگاری اور حقیقت نگاری سے ہوا۔ اس سفر نامے میں عطاء الحق قاسمی کے اپنے پہلے سفر نامے میں اپنے وطن سے محبت دکھائی دینے لگی لیکن پھر "مرحلہ عمر" تک آتے آتے انھیں ہر بری بات، بری بات دکھائی دینے لگی۔ یہی وجہ ہے یہاں پہنچنے سے ان کے ہاں مزاح کم اور طنز کا رنگ نسبتاً زیادہ نظر آنے لگا۔

الف: سماجی صورتحال پر طنز

عطاء الحق قاسمی موجودہ اردو ادیبوں میں اپنی ظرافت اور طنزیہ طرز نگارش کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں۔ وہ پنجاب کے مردم خیز علاقے وزیر آباد میں پلے بڑھے اور جوانی میں لاہور میں مستقل رہائش اختیار کرلی۔ ایک حساس ذہن کے مالک ہونے کی وجہ سے ان کا اندازِ تحریر چونکا دینے والا ہوتا ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے عام فہم جملوں میں بہت کچھ کہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ پنجابی زبان ان کی مادری زبان ہے لہٰذا وہ اردو زبان کے ادیب کی حیثیت سے اپنی فطرت سے پیچھا نہ چھڑا سکے۔ کھیتوں کھلیانوں، کچے مکانوں، رنگ دوڑنگ، بھاگتے بچوں اور انتہائی معمولی درجے کی زندگی گزارتے۔ لوگوں کی بنیادی ضروریات اور خواہشات سے وہ بخوبی آگاہ ہیں، وہ جانتے ہیں کہ نوجوان طبقہ کس خواہشات کے پورا نہ ہونے کے سبب بے راہ روی کا شکار اور ادھیڑ عمری یا ضعیف العمری طبقہ اپنے بچوں کے حوالے سے کن خدشات کا شکار ہے۔ دنیا کے کئی ممالک کی سیر و سیاحت کر چکے ہیں اور کئی ایک ممالک میں سال بہ سال تک پیشہ وارانہ ذمہ داریاں نبھاتے رہے ہیں۔ اسی سبب ان کا سماجی تجربہ انتہائی وسیع ہے۔ وہ اکثر و بیشتر، ظریفانہ درجے کی بہت بڑی بات کہہ جاتے ہیں اور سماج کے ایک بلند پایا نباض ہونے کی حیثیت سے وہ ان وجوہات کا بیان بھی کرتے ہیں جن کے سبب معاشرے کو یہ عوارض لاحق ہو رہی ہیں۔ وہ سفر ناموں میں بیرونی نظاروں سے زیادہ اندرونی حالات کا بیان کرتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی نے اپنی زندگی کے اولین اسفار ۱۹۷۰ء کی دہائی میں کیے۔ یہ وہ وقت تھا جب پاکستان تاریخ کے ایسے دوراہے پر کھڑا تھا جہاں ایک طویل جدوجہد کے نتیجے میں آزاد ہونے والا ملک اپنوں کی غفلت اور اغیار کی سازشوں کے نتیجے میں دولخت ہونے والا تھا۔ اور ہمارا معاشرہ بے یقینی کی کیفیت سے دوچار تھا۔ تاہم اس کے باوجود یقین و امید کی کرنیں بھی اپنی جھلک دکھلاتی ہیں اور ملکی صورتحال گہری نگاہ رکھنے والی ادیبوں کے دلوں میں مثبت تاثر پیدا کر رہی ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جب کوئی سفر نامہ نگار سفر نامہ تحریر کرتا ہے تو غیر محسوس طور پر اس کے سامنے اپنے معاشرے، زبان اور تمدن و رسم و رواج ایک تقابلی پیمانے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس بات کو ہم یوں

بھی بیان کرتے ہیں۔ کہ جب کوئی انسان اپنی مٹی اور لوگوں کے درمیان نہیں ہوتا تو انسانی زندگی کے وہ معمولات اس کے لیے بے حد اہم ہو جاتے ہیں۔ اور باتوں اور انداز و اطوار سے لے کر کھانے اور اٹھنے بیٹھنے کے طریقوں کو نہایت غور سے دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی ایک حساس دِل ادیب ہیں۔ جنھوں نے نہایت جانفشانی ایک ماہر سینٹر کی مانند بیرونی دنیا کے مغربی معاشروں کو نمایاں کیا ہے۔ وہ ایک محب وطن ادیب ہیں جنھوں نے احساسات کو زبان دینے میں کمال مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔

"شوقِ آوارگی"، "دنیا خوبصورت ہے"، "دلی دوراست"، "گوروں کے دیس میں" ان کے چار سفر نامے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی نے دوران سفر نیویارک کے کھوکھلے لوگوں کی کھوکھلی تہذیبوں کا مشاہدہ ہر زاویے سے کرتے ہیں۔ وہ قارئین کے سامنے ان کا بظاہر روشن چہرہ مگر اندرونی طور پر تاریک ہوتا ہے اس کو سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھوں نے وہاں کی طرزِ زندگی اور معاشرت کو بڑی صداقت سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنے سفر نامے "شوقِ آوارگی" میں دیارِ غیر میں جانے والے پاکستانیوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو کہ وہاں جا کر رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جاتے ہیں اور یہ بے جوڑ شادیاں ان کی زندگی کی رونق ختم کر دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنی پاکستانی تہذیب کو بھول کر رہ جاتے ہیں اور مجبوراً وہاں کی بے غیرتی والی زندگی کو گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی نے اپنے اس سفر نامے میں چبھتی ہوئی حقیقتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انسان کے کبھی کبھی جلد بازی یا وقتی فیصلہ اس قدر غلط ثابت ہوتا ہے کہ وہ چاہتے ہوئے تلخیوں اور مجبوریوں کے جام پینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہاں عطاء الحق قاسمی اپنے دوست مقیم ارشد کے حالات کو یوں بیان کرتے ہیں جو کہ معاشرے کی ایک تلخ حقیقت ہے۔

> "بات یہ ہے کہ جس طرح جوان ہونے پر لڑکوں کا سب سے بڑا مسئلہ نوکری کا حصول ہوتا ہے اسی طرح بالغ ہونے پر لڑکیوں کی سب سے بڑی خواہش گھر بسانے کی ہوتی ہے جسے ہم عشق سمجھ بیٹھتے ہیں۔ وہ دراصل قدرےChoiceکا مسئلہ ہوتا ہے ۔ اور اس Choiceمیں بوقت ضرورت ردوبدل بھی ہو سکتا ہے۔"(۵)

یہاں عطاء الحق قاسمی ان حقیقتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو بیرون ملک رہنے والے پاکستانیوں کے ساتھ پیش آتی ہیں اور یہی لوگ پھر شیر کی طرح ایک دن کی زندگی پر گیدڑ سو سالہ زندگی کو ترجیح دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ شوقِ آوارگی جاری رکھتے ہوئے ایک شہر سے دوسرے شہر پہنچتے ہیں۔ وہ کبھی آبل وارن، کبھی ایمسٹراڈیم کے کسی ہوٹل میں ہوتا ہے۔ تو تو کبھی پیرس کی گلیوں میں ہوتا ہے۔ وہ دوران سفر قاری کو کبھی نہیں بھولتا اس لیے وہ جس چیز کو بھی دیکھتا ہے۔ تمام جزئیات اور معلومات اپنے مخصوص سٹائل کی وجہ قاری تک پہنچاتا ہے اور وہ مفت میں بیٹھے بیٹھائے سیر کروادیتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ پیرس کے سفر کے دوران وہاں کی طرزِ زندگی اور وہاں پر مقیم باشندوں کی معاشرت کو بڑے غور و حوض سے دیکھتا ہے اور اس کو اپنے سفر نامے میں جوں کے توں بیان کر دیتا ہے۔ وہ پیرس میں زولا کے ساتھ جب اولڈ پیپلز جاتا ہے۔ دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے کہ وہاں کے لوگ اپنے ماں باپ کو بیگانوں کی طرح پھینک دیتے ہیں اور ان کو گزرے ہوئے وقت کی طرح بھول جاتے ہیں اور ایک پلیٹ فارم پر مرنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ وہاں اپنے بوڑھے شخص سے ملتے ہیں اس کے بارے میں بتاتے ہیں۔

> "شروع شروع میں جب وہ ہمیں یہاں داخل کراتے ہیں جو پروپیگنڈا پر ملنے آتے ہیں۔ اس کے بعد وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ گیپ ڈالنا شروع کر دیتے ہیں اور پھر ایک مہینے کے بعد اپنی شکل دکھاتے ہیں رفتہ رفتہ یہ عرصہ طویل ہو جاتا ہے اور پھر ان سے صرف کرسمس کے موقع پر ملاقات ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کرسمس پر ان کی بجائے ان کی طرف سے کرسمس کارڈ موصول ہوتا ہے اور پھر ایک دن اطلاع ملنے پر وہ میت وصول کرنے آجاتے ہیں جس کی آنکھیں اپنے بیٹوں کے انتظار میں مرنے کے بعد بھی کھلی ہوتی ہیں۔"(۶)

عطاء الحق قاسمی نے ایسے انسانیت سوز مناظر مغرب کی مادیت پرستی پر گہرا طنز کرتے ہیں جو معاشرہ اس قدر کھوکھلا ہو گیا جہاں پر والدین جیسی عظیم اور مقدس ہستیوں کو فالتو سامان کی طرح باہر پھینک دیا جاتا ہے۔ ایسا معاشرہ کیسے ترقی یافتہ کہلا سکتا ہے؟ عطاء الحق قاسمی نے وہاں کے بزرگوں کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ کیسے کرب و بے بسی کی زندگی سے گزرتے ہیں۔ مصنف نے ان کیفیات اور محسوسات کو اس طرح پیش کیا ہے جسے ایک سنگدل قاری بھی پڑھے تو اس کی آنکھیں نم ہو جائیں۔ اس منظر نامے کو دیکھ کر مغرب کے مشینی نظام سے سخت نفرت ہونے لگتی ہے۔

ہمارا معاشرہ ایک طویل عرصے سے غیر متوازن طور پر زندہ رہنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ معاشی اور معاشرتی سطح پر کٹھن حالات کا سامنا تقریباً دنیا کی ہر ترقی یافتہ قوم نے کیا ہے۔ اور طویل جدوجہد کے بعد کامیابی حاصل کی ہے۔ بد عنوانیت اور منافقت ہمارے معاشرے میں کینسر کی طرح سرائیت کر چکی ہے۔ تیزی سے بڑھتی آبادی کے پیچھے جن عوامل کو بیان کیا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ لوگ ضعف پیری کے عالم میں بدترین معاشی صورتحال سے نہ گزرنے کے خوف میں مبتلا رہتے ہیں۔ ذہن کے نہاخانوں میں کہیں یہ اندیشہ پوشیدہ رہتا ہے کہ جب وہ بوڑھے ہو جائیں گے گزر اوقات کے لیے اس کے سامنے دست دراز کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس خوف میں مبتلا ہماری آبادی میں بے تحاشا اضافہ کا سبب بن رہی ہیں۔ دوسری جانب یہ خوف ہمارے لوگوں کو وقت سے پہلے بڑھاپے کی طرف دھکیل رہا ہے۔ اپنے ملک کے معاشی حالات اور معاشرہ پر پڑنے والے اس کے برے اثرات کا جب عطاء الحق قاسمی کے ذہن میں اثر پڑتا ہے اور وہ ایک بازار میں ایک جوان خاتون کو پشت پر لادے دیکھتے ہیں تو وہ اختیاران کی خوشی اور ترنگ کا موازنہ اپنے ملک کے لوگوں سے کرتا ہے۔

> "ان میں سے ایک تیس تیس سالہ خاتون بھی تھی۔ جس سامان کی کٹ کی جگہ اپنا چار ماہ کا "بے گلیکسو" قسم کا ایک خوبصورت سا بچہ کمرے کے ساتھ ایک ٹوکری میں لٹکایا ہوا تھا اور اپنا سامان ٹرالی نما چیز میں لادے لیے جارہی تھی، میں نے اسے دیکھ کر سوچا یہ لوگ بھی عجیب ہیں۔ زندگی کے ہر مرحلے اور جکڑے ہوئے حالات میں بھی زندگی کا رسیلا رس پینا چاہتے ہیں جب کہ ہم لوگ جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھنے سے پہلے ہی بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں کی عورتیں تو اس معاملے میں مردوں سے دو چار ہاتھ آگے ہیں ادھر شادی ہوئی اور اُدھر ہم نے دیکھا کہ اچھی خاصی لڑکیوں نے بھی خود کو بڑی بوڑھیوں میں شمار کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ ان کے شروع کے چند ماہ تو دولہے کے ساتھ گزرتے ہیں اور بقیہ تمام عمر چولہے کے ساتھ بسر ہوتی ہے۔"(۷)

عطاء الحق قاسمی کا یہ سفر طنز کی ایسی کاٹ لیے ہوئے جس کے پس پردہ دراصل ان کی وطن سے محبت کارفرما ہے۔ اپنے سفر ناموں میں وہ سچے محبت وطن کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے سفر ناموں میں نہ صرف مغرب کی خوبیوں کا ذکر کیا ہے۔ بلکہ ان کے کھوکھلے پن کا بھی پردہ چاک کیا ہے۔ مرعوبیت کی فضا ان کے ہاں ہمیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔ بلکہ وہ کہیں کہیں ہمیں رشک کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنے وطن کو یا اہلِ وطن کو کمتر نہیں سمجھتے بلکہ مغربی نظام کی خوبیوں کو اس خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔ قاری بھی ان سے اتفاق کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر فوزیہ چودھری کچھ یوں بیان کرتی ہیں:

> "وہ اہلِ وطن کو ان خامیوں سے آگاہ ضرور کرتے ہیں لیکن نصیحت کے انداز میں یا طعنہ و تشنیع کے ذریعے نہیں۔ بلکہ تبصرے کے انداز میں انداز ایسا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ یہ معمولی بات ہے۔ ان کا یہی ہلکا پھلکا انداز قاری کو اصلاح کی طرف مائل کر جاتا ہے۔"(۸)

عطاء الحق قاسمی ہمیں یورپ کی زندگی کے بارے میں بتاتے ہیں ان کی زندگی ایک مشین کی طرح ہے۔ مغرب کے لوگ ہر وقت مصروف نظر آتے ہیں۔ سب پر پیسہ کمانے کی دُھن سوار ہوتی ہے۔ وہ اپنے قرضوں کو ادا کرنے کے لیے دن رات مشینوں کے آگے بیٹھ کر کام کرتے ہیں تاکہ کریڈٹ کارڈ کمپنیوں کا ادھار واپس کیا جاسکے۔ یہاں پر مصنف نانسلو ویسٹ کی مشینی تہذیب کا ذکر اس اقتباس سے کرتے ہیں۔

> "ہانسلو ویسٹ کے ٹیوب اسٹیشن کی طرف پیدل ہی چل پڑا۔ آج سورج نکلا ہوا تھا۔ چنانچہ انگریز جامے سے باہر ہو رہے تھے۔ مردوں نے ہمارے بھاٹی گیٹ کے پہلوانوں کی طرح قمیض اتار کر کندھوں پر ڈالی ہوتی تھی اور عورتیں حسبِ توفیق موسم کا لطف لے رہی تھیں۔ اتنے صحت مند جسم اور خوبصورت چہرے مگر ایک ایسے نظام کے شکنجے میں کیسے ہوئے جس نے آغاز میں مشینوں کو انسان کا تابع بنایا لیکن اب یہ مشینیں انسان کو گلوبل آئل کے طور پر استعمال کر رہی ہیں جس طرح قربانی کے نظام میں انسانوں کو صحت مند ہونا ضروری ہے تاکہ مشین کی "کالی دیوی" ان کی قربانی قبول کر سکے۔"(۹)

عطاء الحق قاسمی ہمیں یورپی اقوام لوگوں پر ترس کھاتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ وہاں کی زندگیاں بہت زیادہ استوار ہوتی ہیں۔ وہ لوگ سارا دن کاموں میں مشغول رہے۔ جب وہ کام کے بعد اپنے گھروں میں لوٹتے ہیں تو انھیں اپنے گھروں میں کام خود کرنا پڑتا وہ اپنے کپڑے خود دھوتے ہیں۔ کھانا خود بناتے ہیں۔ جھاڑ پونچھ کرتے ہیں اور یہ سارے کام وہاں کا ہر شخص کرتا ہے۔ کاش یہاں کے سب لوگ اپنے کام خود کرنے کے عادی ہو جائیں۔

عطاء الحق قاسمی اپنے سفر ناموں میں مغرب کی معاشرتی زندگی کو سود وزیاں ہو کر دیکھتے ہیں۔ انہوں نے زندہ دلی، لطیفہ نگاری اور جملہ بازی کو سفر نامے میں استعمال کیا اور اپنے نرگسی مزاج کی برتری کو قائم کرنے کے لیے تخلیقی و قائع نگاری سے کام لیا ہے۔ ان کی چٹخارے دار باتیں ان کی ذہانت اور شوخ طبعیت کو گم نہیں ہونے دیتی۔ عطاء الحق قاسمی امریکی معاشرے میں رہتے رہتے عطاء الحق قاسمی جنس کی ارزانی اور عورت کی بے توقیری پر جلتے کڑھتے نظر آتے ہیں۔ جس میں ان کی نظر میں ایسے عوامل شامل ہیں جو ہمارے معاشرے باوجود مادیت کے نظر آتے ہیں۔ قطاروں میں بنے ہوٹل اور کلبس جن میں انسانیت سوز حرکات ہوتی ہیں۔ عطاء الحق قاسمی کے سخت افسوس کا باعث بنتی ہیں۔ ایسا معاشرہ جہاں دولت کمانے اور خرچ کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا یہ صورتحال افسوس ناک ہے۔ اگرچہ امریکی اور یورپی معاشروں کی تصویریں دکھاتے ہوئے عطاء الحق قاسمی نے اپنے معاشرے سے موازنہ نہیں کیا۔ مگر دماغ کے نہاں خانوں میں کہیں وہ یاد داشتیں لازمی طور پر موجود ہیں جو ان کے پاکستانی معاشرے سے ہونے کی پہچان ہے۔ عورت کی بے توقیری کا یہ پہلو اور اس پر طنز اور افسوس عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں اس قدر عام ہے کہ اس کی وجہ سے اس معاشرے کے دیگر خوبصورت پہلو مکمل طور پر برباد ہو گئے ہیں۔ مصنف نے رستوں کی خوبصورتی صفائی اور ستھرائی، قوم اور بازاروں میں چہل پہل سے متعلق زیادہ نہیں لکھا۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ پہلو معاشرے پر طنز اور تاسف کی وجہ سے منظر سے غائب ہو گئے ہیں۔ مصنف بتانا چاہتا ہے کہ صرف مادی ترقی اور آرام و آسائش سے بھرپور زندگی انسانی ذہن اور دل و دماغ کو تقویت نہیں پہنچاتی بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ آرام و آسائش کے ساتھ ساتھ ایسے انتظامات بھی کیے جائیں جن کی مدد سے اعلیٰ انسانی اقدار کو پنپنے اور تقویت ہائے کا موقع ملے۔

"یورپ اور امریکہ کا کوئی مہذب شہر ایسا نہیں جہاں شام کے بعد کسی کی عزت، جان و مال محفوظ ہو۔ یہ کیسا نظام ہے جہاں دولت کی ریل پیل ہے مگر راہ گیروں سے ان کے پرس چھین لیے جاتے ہیں اور یہ کیسا نظام ہے جس میں جنس کی فراوانی ہے۔۔۔۔۔وہ خرابی کہاں واقع ہے۔ کہیں اس کی بنیادوں میں تو نہیں؟۔"(۱۰)

عطاء الحق قاسمی نے یہاں کی مغرب میں پروان چڑھنے والے منفی رویوں کی عکاسی کی ہے۔ انھوں نے مغرب کی ننگی تصویر کو چھپا کر پیش نہیں کیا بلکہ وہ بعینہٖ پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جتنی تذلیل عورت کی مغرب نے کی ہے۔ شاید ایسا کبھی کہیں نہیں دیکھا گیا۔ عورتوں پر ظلم و تشدد کر کے ان پر کتے چھوڑنا اس طرح کی گھناؤنی حرکات کرنا مغرب والوں کا شیوا بن چکا ہے۔

قانون کی عمل داری کا نہ ہونا ہمارے مجموعی سماجی نظام کا حصہ ہے۔ اس کی وجہ سے ہمارا ملک انتہائی ابتر صورت حال کا سامنا کر رہا ہے۔ ستر کی دہائی کے قریب آزاد ہونے والا ملک سنگاپور صفائی اور ستھرائی اور قانون کے حکمران کے حوالے سے انتہائی نمایاں ملکوں میں شمار ہوتا ہے۔ جس کے عامرانہ مزاج رکھنے والے حکمران لی کیو آن نے سنگاپور کے لوگوں کی قسمت بدلی ہے۔ سنگاپور کی صفائی، نفاست اور آرائش و زیبائش دیکھ کر نگاہوں میں بھروسہ نہیں ہوتا کہ کم و بیش ساٹھ برس قبل آزاد ہونے والا یہ ملک اپنے حکمرانوں کی زیرک نگاہی اور خلوص کی بدولت تہذیبی اور مادی ہر دو حوالوں سے ترقی کے عروج پر کھڑا ہے اپنے پاکستان میں جہاں قانون کی حکمرانی کا تصور بہت ڈھیلا ڈھالا اور کمزور ہے کہ لوگ جب وہاں جاتے ہیں تو انہیں یہ پابندیاں ملتی ہیں۔

"مگر سچی بات یہ ہے کہ اس مختصر سے ملک کا رقبہ (رقبہ ۲۲۱ مربع میل اور آبادی لاہور کے گلبرگ جتنی) کے اصول ہمیں کچھ زیادہ پسند نہیں آئے۔ سگریٹ نوشی پر مکمل پابندی، صرف بغیر چھت والے مقامات پر پینے کی اجازت ہے۔ لمبے بالوں والے سیاحوں کا شہر میں داخلہ بند، جس نے داخل ہونا ہے انسانوں کی طرح حجامت بنوا کر داخل ہو، سڑکوں پر تھوکنے اور کاغذ کا ٹکڑا تک پھینکنے کی سخت ممانعت، خلاف ورزی پر بھاری جرمانے کے علاوہ کوڑے بھی مارے جاتے ہیں۔"(۱۱)

انتہائی زیادہ آبادی اور مفلسی کی وجہ سے ہمارا معاشرہ بہت زیادہ مشکلات سے دوچار ہے۔ جس کی وجہ سے ہماری خوبیاں دب گئی ہیں اور خامیاں سامنے آچکی ہیں۔ آسٹریلیا میں جب ان کا ایک ہم سفر مغربی اقوام پر طنز کرتا ہے۔ تو ایک جملے میں ساری صورتحال کو بیان کر دیتا ہے۔

"قاسمی صاحب! یہ قومیں طوائفوں کی طرح بے حد مہذب اور انہیں کی طرح اپنے شکار کی کھال اتارنے والی ہیں۔"(۱۲)

سولھویں صدی میں قبل یورپ میں کلیسا کا کردار بے حد اہم تھا جس نے یورپ کے لوگوں کو مذہب سے بیگانہ کرنے کی تحریک چلانے پر مجبور کر دیا۔ دنیا کی بیشتر اقوام آج کل ایسا آئین تشکیل دے چکی ہیں جس میں مذہب کو ذاتی معاملہ قرار دیتے ہوئے مکمل طور پر نکال چکی ہیں۔ اس وجہ سے مذہب پر ہونے والے مباحث کو یورپ میں کوئی پذیرائی حاصل نہیں ہوئی۔ سائنس پر مبنی ذہن و دل اور مادیت پرستی آج کے انسان کا بنیادی ماٹو ہے۔ موجودہ پاکستانی معاشرہ بھی مادیت کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے بند خانے میں ناکام رہا ہے تاہم اب بھی بہت سی اخلاقی اقدار موجود ہیں۔ جنھوں نے ہمارے معاشرے کو مکمل شکست وریخت سے بچائے رکھا ہے۔ اسلام صرف ایک مذہب نہیں بلکہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ جس میں زندگی کے ہر پہلو سے متعلق رہنمائی موجود ہے۔ جس میں زندگی کے ہر پہلو سے متعلق رہنمائی موجود ہے۔ حلال و حرام کے پیمانے بھی اسلام میں مکمل طور پر واضح اور نمایاں ہیں۔ لیکن ہم اپنے مادی فوائد کے لیے اسلامی طریقے سے ذبح شدہ جانور اور پرندے کھاتے ہیں مگر مال وزر کے حصول میں ان پیمانوں کا کوئی استعمال نہیں کرتے۔ مصنف نے مذہب اور معاشرت میں تضاد کو یوں نمایاں کیا ہے۔ یہ تضاد یا رویہ ہمارے مجموعی کردار کی بھرپور تصویر کشی کی ہے۔

"قرب و جوار میں میکڈانلڈ ہی واقع تھا لہٰذا درویشوں کا یہ قافلہ میکڈانلڈ پہنچا۔ اب مسئلہ حرام حلال کا تھا۔ بیف اور چکن کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ذبیحہ میں یا نہیں حالانکہ سنگاپور میں گوشت کا کاروبار مجموعی طور پر مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے لیکن "تقوی" کا تقاضا یہ تھا کہ فحش سینڈوچ گزارا کیا جائے اسی فیصلے پر عمل کیا گیا اگر ہم

کاروبار اور دیگر معاملات میں بھی حرام حلال کا اتنا ہی خیال رکھیں تو ہمارا شمار دنیا کی بہترین قوموں میں ہو لیکن ایسا ممکن نہیں کیونکہ اس نوع کے حلال حرام کا خیال رکھنے سے ایمان مضبوط اور بینک بیلنس کمزور ہو جاتا ہے۔ در اصل انسان مذہب کے صرف ان پہلوؤں پر عمل پیرا ہوتا ہے جو اسے "سوٹ" کرتے ہیں، مذہب کا جو پہلو "مذہب زد" سے متعادم ہو گا وہاں اللہ تعالیٰ سے معذرت کر لی جائے گی۔"(۱۳)

عطاء الحق قاسمی نے سفر یورپی ممالک میں ایک چیز کو نوٹ کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ یورپی ممالک میں مانگنے والوں کی بڑی تعداد بھیک مانگتی نظر آتی ہے۔ ان میں بوڑھے اور جوان شامل ہیں۔ نوجوان طبقہ بھیک مانگتا پھرتا ہے اور جبکہ وہ کام کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ وہ محنت کرنے سے زیادہ سے زیادہ آسان کام دست درازی کو سمجھتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی اس صورتِ حال کو دیکھ کر افسوس کرتے ہوئے ان پر گہرا طنز کرتے ہیں اور ماضی کی طرف چلے جاتے ہیں اور برطانیہ کی بھکاری نسل پر کچھ یوں طنز کرتے ہیں:

"برقی سیڑھیوں کے پاس چار نوجوان گٹار پر گانا گا رہے تھے یہ وہی گانا تھا جس کے متعلق ایک فلمی شاعر نے کہا تھا

ٹین کنستر پیٹ پیٹ کر گلا پھاڑ کر چلانا

یار میرے مت برا مان نہ گانا ہے نہ بجانا

ان میں ایک نوجوان اپنا پیٹ راہ گیروں کے آگے پھیلا کر کھڑا تھا۔ لوگ اس میں سکے ڈالتے تھے، کچھ بے پروائی سے فرش پر پھینک کر آگے نکل جاتے تھے ۔ یہ برطانیہ کی بھکاری نسل تھی جس کے آباؤ اجداد تاجروں کے روپ میں ہندوستان آئے اور پھر پورے برصغیر پر قابض ہو گئے۔ دوسری جنگ عظیم اور بعض دوسرے عوامل کے نتیجے میں جب ان کی تمام نو آبادیاں اور کڑکے ان کے ہاتھ سے نکل گئیں جہاں سے لوٹ کھسوٹ کر کے وہ اپنے ہاں خوشحالی لاتے تھے تو ان پر تنگ دستی کا دور آیا۔ جس کی شدت میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا چنانچہ اس فلاحی مملکت کے باشندوں سے بہت سی مراعات حکومت ایک کر کے واپس لے رہی ہے یہ بھکاری نسل برطانیہ کی معاشی بد حالی کے علاوہ ذاتی ہڈ حرامی کی پیداوار ہے۔"(۱۴)

عطاء الحق قاسمی مغرب کی زندگی کو ایک مبصر کی آنکھ سے دیکھتے ہیں جس کے پاس اعلیٰ مشرقی اقدار اور اخلاقیات کا سرمایہ بھی اور تعصب سے پاک نظر بھی جو اردگرد کے مظاہر، واقعات اور زندگی کو وسیع المشرقی کے انداز میں دیکھتی ہے۔ جو اچھی چیزوں کو داد دیتی اور برائی کی نفی کرتی ہے۔ عطاء الحق قاسمی ایک جگہ اپنے ملک کے حالات کے ساتھ نباہ کرنے کا بتاتے ہیں۔ مصنف نے طنزیہ انداز میں انگریزوں کی ایک خراب اور ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی ایک مثبت اور تعمیری عادت کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کے مطابق انگریز اور پاکستانی دونوں اقوام کے لوگ یورپ میں سخت محنت سے کام کرتے ہیں مگر یورپی لوگ ان پیسوں کو عیاشیوں میں صرف کرتے ہیں۔ مگر دوسری جانب پاکستانی اور ہندوستانی جائیدادیں بنانے میں اور محفوظ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی روزمرہ کی زندگی انگریزوں سے مختلف نظر آتی ہے جب وہ اپنے ہی ملک میں اجنبیوں کو صاحبِ جائیداد عہدے دیتے ہیں غیر متوقع طور پر غصہ نظر آتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی تاریخ کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ انگریزوں نے اپنے کم و بیش ۶۵۰ برس کی حکومت پر برصغیر کو اتنی بے دردی سے لوٹا تھا اور انھیں مستقل طور پر غلام رکھنے کے لیے کتنی کڑی محنت کی تھی۔ وہ انگریز بھکاریوں پر یوں طنز کرتے ہیں:

> "مصنف یہ بتاتا ہے کہ انگریز بھکاری بن کر آئے اور یہاں کے حکمران بن بیٹھے۔ گویا یہ بھکاری پن انھیں ورثے میں ملا ہے۔۔۔۔۔۔" (۱۵)

مصنف نے گوروں کے بھکاری پن سے متعلق بات کرتے ہوئے ان کی ذہنیت کی بھرپور عکاسی کی ہے جو کئی برس برصغیر پر قابض رہے۔ یہاں کے لوگوں کو اپنی تہذیبی و ثقافتی برتری کا احساس دلانے کی کوشش کرتے رہے اب اس وقت انگریز ہر طرح کے لوگوں کی منت سماجت کر کے پیشہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مصنف کے تمام سفرناموں میں سماج پر طنز کے مظاہر جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں کہیں طنز میں ظرافت کا پہلو ہوتا ہے اور کہیں احساس کا کہیں ذمہ داری ان سے ظرافت چھین کر انھیں مبلغ بنا دیتی ہے۔

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک لکھتے ہیں:

> "گوروں کے دیس میں" ہماری ملاقات ایک ایسے عطاء الحق قاسمی سے ہوتی ہے جو "شوقِ آوارگی" کے عہد کا آدمی نہیں ہے۔ بلکہ ان کی ادبی پہچان ہے۔ ان کا اہل قلم میں مقام و مرتبہ تسلیم شدہ ہے۔" (۱۶)

مصنف کے آباؤ اجداد جموں کے علاقے سے ہجرت کر کے امر تسر اور قیامِ پاکستان کے بعد امر تسر سے وزیر آباد اور لاہور آباد ہوئے تھے اس لیے بھارت کے سفر کے وقت انہیں امر تسر سے پیار اس وجہ سے بھی زیادہ محسوس ہو تا ہے کہ کوئی وقت تھا جب ان کے جدِ امجد امر تسر میں مقیم تھے۔ امر تسر کے سفر کے دوران ان کی نظروں میں معیشت یا معاشرت سے زیادہ حقیقت پر مبنی تھا اور جہاں عقیدت کا معنی و مفہوم سامنے آجائے تو دیگر جذبے ان کے اس جذبے کے سامنے کمزور پائے جاتے ہیں۔

> " ایک صاحب کے ہاتھوں میں زائرین کے ناموں کی فہرست تھی۔ وہ ان سے کوئی نام پکارتے اور اس کے حاضر ہونے پر دستار اس کے سر پر باندھنے کے بجائے گلے میں ڈال دیتے۔ یہ دستار بندی نہیں تھی جس کے لیے میں کئی دن سے ایکسائٹڈ پھر رہا تھا، بلکہ یہ تو جلسہ تقسیم دستار، قسم کی کوئی چیز تھی۔۔۔۔۔۔اور پھر دستار کے تصور کے ساتھ میرے ذہن میں سبز رنگ اُبھر تا تھا، مگر یہاں دستاریں تقسیم ہو رہی تھیں وہ پنجاب کے میلوں میں نظر آنے والے لاچوں کی طرح رنگ برنگی تھیں اور اس پر طرہ یہ کہ کناروں پر کرن اور گوٹا وغیرہ بھی لگایا تھا۔"(۱۷)

بھارت کے سیاسی حلقوں کے علاوہ سماج میں پائے جانے والے مسلم دشمن عناصر کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ان لوگوں نے مذہب کو بنیاد بنا کر ہندو او مسلمان مین بہت زیادہ خلا پیدا کر دیا ہے۔ ہندوستان میں مسلم کش فسادات کی ہر لہر کے پیچھے ہندو بنیاد پرستوں کا ہاتھ ہو تا ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے انھیں آدم خور قرار دیتے ہیں جو لوگ مذہبی بالادستی کو بنیاد بنا کر معصوم انسانوں کا خون بہاتے ہیں۔

> " ویجیٹیرین یا نان ویجیٹیرین؟ ویٹر نے پوچھا انڈیا میں ہر جگہ کھانے سے پہلے یہ سوال پوچھا جاتا ہے۔ یعنی آپ سبزی خور ہیں یا گوشت خور؟ حالانکہ سبزی اور گوشت خور کے ساتھ آدم خور بھی پوچھنا چاہیے کہ مذہب کے نام پر انسان کا خون پینے والے بھی بہت ہیں۔"(۱۸)

عطاء الحق قاسمی نے اپنے سفر نامے دلی دور است میں امر تسر اور لاہور میں کئی حوالوں سے یکسانیت کا ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ یہ پہلے بتایا گیا ہے کہ عطاء الحق قاسمی کی جائے پیدائش امر تسر ہے اسی لیے جائے پیدائش سے عقیدت ایک طرف مگر لاہور میں اپنی زندگی کے بیشتر دنوں میں انہوں نے پاکستانی سماج اور ثقافت کے جتنے رنگ

ملاحظہ کیے ہیں وہ انہیں ہندوستان کے سفر کے دوران بھی نظر آتے ہیں۔ ایک الگ نظریے اور حکومت کے زیرِسایہ زندگی گزارنے اور مختلف مذہب رکھنے کے باوجود زبان اور ثقافت کے لحاظ سے کئی مشترک عادات پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتی ہیں۔ سفر حیدر آباد کے دوران بھی کئی جگہ اس قسم کی صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

"جس طرح شیروانی حیدر آبادیوں کا قومی لباس ہے اسی طرح بریانی ان کی قومی ڈش ہے۔"

بقول شاہ صدیقی:

"کچھ لوگ حیدر آبادی بریانی کے مقابلے میں لکھنوی پلاؤ کو کھڑا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر یہ ایسے ہی جیسے انیس کے مقابلے میں دبیر کو کھڑا کرنے کی کوشش کی جائے۔"(۱۹)

پاکستانی اور ہندوستانی ثقافت میں یکسانیت کا ذکر وہ کئی طرح سے کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں حلال و حرام کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ آپ کو سوٹ کرے یا مناسب وہ تو حلال کے زمرے میں آتا ہے۔ مگر جہاں پر مفاد کا تضاد ہو جائے وہاں صورتحال مختلف ہو جاتی ہے۔ عطاء الحق قاسمی اس حوالے سے اپنے ہندو دوست کی روداد یوں بیان کرتے ہیں۔

"ایک دفعہ ہندو دوست کیول لاہور میں میرے ہاں مہمان ہوا۔ کھانے کی میز پر شامی کباب بھی تھے۔ میں نے اسے باری باری ہر چیز چکھنے پر اصرار کیا مگر اس کے مذہبی معتقلات کے پیش نظر ان کبابوں کی دعوت نہیں دی۔ جبکہ وہ کھانا کھاتے ہوئے بارہا "ٹیڑھی" آنکھوں سے اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ بالآخر اس سے نہ رہا گیا اور اس نے مجھ سے پوچھا "یہ کباب کس چیز کے بنے ہوئے ہیں پیشتر اس کے کہ میں اسے بتاتا گائے کے گوشت کے ہیں۔ اس نے ایک کباب اٹھا کر منہ میں ڈالا اور کہا دیکھی جائے گی جو ہو گا!۔"(۲۰)

بھارت ۱۹۴۷ء میں اپنے قیام کے فوراً بعد ہی آئین سازی میں کامیاب رہا تھا اور ان کے ہاں کبھی کسی غیر جمہوری قوتوں کی حکومت نہیں آئی لیکن آبادی کے علاوہ وسائل کی تقسیم نے بھارت میں شدید قسم کے سماجی اور معاشی مشکلات پیدا کیں۔ امیر اور غریب طبقات دو الگ انتہاؤں میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ بمبئی کا شمار کراچی کی مانند دنیا کے انتہائی گنجان آباد شہروں میں ہوتا ہے۔ جس میں امیر اور غریب مکمل طور پر الگ اور جداگانہ حیثیت سے آباد ہیں۔ بلند عمارتوں، خوبصورت گھروں اور سبزہ زاروں کے پاس ایسے انسان آباد ہیں جنہیں ایک وقت کی روٹی بھی مشکل ملتی ہے۔ جو اپنی زندگی کا بیشتر حصہ بغیر چھت اور چادر کے گزار دیتے ہیں۔ جانوروں کی مانند گزر بسر کرتے یہ لوگ ہمارے معاشرہ بد نما داغ ہیں۔ جنہیں سرمایہ داری کے بدترین نتائج کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ مصنف جب بمبئی جاتا ہے تو اپنے شہروں اور دیہاتوں سے غیر محسوس طور موازنہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک تقریب میں:

> ”یہ ہے گھر لوگ ایک طویل عرصے ان فٹ پاتھوں پر زندگی بسر کر رہے ہیں انہی فٹ پاتھوں پر شادیاں ہوتی ہیں۔ ایک فٹ پاتھ سے دوسرے فٹ پاتھ پر بارات جاتی ہے۔ انہی فٹ پاتھوں پر بچے پیدا ہوتے ہیں۔ بوڑھے ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں اور پھر انہی فٹ پاتھوں سے ان کی ارتھی اٹھتی ہے بھارت کا مراعات یافتہ طبقہ دو باتوں پر بڑا فخر کرتا ہے۔ ایک اپنی جمہوریت اور دوسرا بھارت کی اقتصادی ترقی پر ۱۹۸۲ء میں دہلی جانا ہوا۔ ممتاز ناول نگار اور رکن پارلیمنٹ جناب حیات اللہ انصاری نے میرے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا جس میں مختار شخصیتوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ میرے برابر والی نشست پر محترمہ محمودہ بیگم تشریف فرما تھیں جو کشمیری نژاد ہیں اور اس زمانے میں اندرا گاندھی کے ناک کا بال سمجھی جاتی تھیں انھوں نے آمریت کے خلاف میرے جذبات کو مزید مشتعل کرنے کے لیے اپنی جمہوریت کے قصیدے پڑھنا شروع کر دیئے پہلے میں انھیں طرح دیتا رہا مگر تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق میں نے کہا ”بیگم صاحبہ! ہم ایک عرصے سے آمریت کے شکنجے میں بس رہے ہیں ہم اس پر نادم ہیں اور اپنے ملک میں اس کے خلاف جدوجہد میں بھی

مشغول رہتے ہیں مگر آپ کی جمہوریت نے کلکتہ اور بمبئی کے فٹ پاتھوں پر پلنے والی اپنی مخلوق میں دن بدن اضافے کے علاوہ آپ کا کیا دیا ہے آپ میرے مہمان کے طور پر پاکستان تشریف لائیں، اگر آپ کو کراچی سے پشاور تک ایک شخص بھی فٹ پاتھ پر زندگی گزارتا مل جائے تو میں آپ کی جمہوریت اور اس کی افادیت کا قائل ہو جاؤں گا۔" (۲۱)

مصنف کے تمام سفر ناموں میں سماج پر طنز کے مظاہر جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں طنز میں ظرافت کا پہلو اور کہیں احساس کہیں ذمہ داری ان سے ظرافت چھین کر انھیں مبلغ بنا دیتی ہے۔ غرض عطاء الحق قاسمی کے تمام سفر نامے طنز اور مزاح کے بہترین نمونے قرار دیے جاسکتے ہیں۔

ب: سیاسی صورتحال پر طنز

عطاء الحق قاسمی اپنے سفر ناموں میں سیاح کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ جو گلیمرس لائف میں حقیقی زندگی کا متلاشی ہو۔ وہ دورانِ سیاحت جن باشندوں سے بھی ملاقات کرتے ہیں ان سب کا احوال ان کے سیاحت ناموں میں ہمیں ملتا ہے۔ وہ انسان کو کائنات کا مرکز کہتے ہیں۔ ان کی تحریریں انسان ہی کے گرد گھومتی نظر آتی ہیں۔ ان کے سفر ناموں میں ایک سیاح کے سفری تاثرات نظر نہیں آتے بلکہ ان میں طبقاتی کشمکش، منافقانہ رویوں، غیر منصفانہ نظام اور سماج کی اونچ نیچ پر طنز کے ساتھ ساتھ ہمیں سیاسی تجزیے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں مزاح کے ساتھ ساتھ طنز کا عنصر بھی شامل ہوتا۔ ان کا یہ طنز ہمارے معاشرتی اقدار اور سیاسی صورتحال پر زیادہ ہوتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں سیاسی شعور پوری آب و تاب کے ساتھ جھلکتا ہے۔

۱۹۶۰ء کی دہائی میں پاکستان معاشی سطح پر تیزی سے ابھرنے والے ممالک میں سے ایک تھا۔ لیکن سیاسی طور پر پاکستان ہمیشہ غیر مستحکم سیاسی تاریک رکھنے والے ممالک میں شمار ہوتا ہے۔ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد قراردادِ مقاصد کو سامنے رکھ کر آئین سازی کرنے کی کوشش کی گئی بد قسمتی سے قائداعظم کی وفات کے بعد کوئی ایسا رہنما نہیں مل سکا جو آئین سازی کے پیچیدہ کام کو انجام دینے میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتا۔ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۶۰ء کی دہائی میں پاکستان کے لوگوں کی بیرون ملک تعداد بہت کم تھی۔

۱۹۷۳ء کا آئین بننے کے بعد عام پاکستانیوں کے لیے پاسپورٹ کا حصول آسان کر دیا گیا جس کے سبب بہت سارے پاکستانی یورپ امریکہ اور مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں مستقل بنیادوں پر آباد ہو گئے۔ عطاء الحق قاسمی ایک مضبوط ادبی فکر کے ساتھ سیاسی بلوغت بھی رکھتے ہیں۔ ان کے چاروں سفر ناموں میں اس ملک کے سیاسی حالات پر بھی دلچسپ تبصرہ نظر آتا ہے۔ انھوں نے سویڈن، ناروے، تھائی لینڈ، سنگاپور، امریکہ، جرمنی، انگلینڈ اور ہندوستان کے سیاسی حالات کا پاکستان کے سیاسی حالات کے ساتھ موازنہ کیا ہے اور ایک پاکستانی سیاسی پس منظر رکھتے ہوئے بیرونی دنیا کے حالات کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں برصغیر سے نکلنے سے قبل برطانیہ، امریکہ سے نکل چکا تھا۔ رفتہ رفتہ آسٹریلیا اور کینیڈا کے مقبوضات بھی اس کے ہاتھ سے نکل گئے ایسے میں دنیا کے بیشتر ممالک برطانوری عملداری میں تمام رہے۔ آئرلینڈ اور سکاٹ لینڈ کے ممالک برطانیہ سے نکلنے کی کوششوں میں جت گئے اور اس کام میں انہیں جزوی کامیابی ملی بہت زیادہ ہلاکت خیزی اور آئرش پبلکن آرمی کی تنظیم کی وجہ سے برطانوی افواج کا آئرش عوام پر ظلم برطانوی تاریخ کا ایک تاریک باب ہے۔ جن دنوں عطاء الحق قاسمی نے امریکہ کا سفر کیا۔ برطانیہ میں سیاسی عدم استحکام کا شکار تھا اور اُسے بھی ایسی ہی بغاوت کا سامنا تھا جس طرح پاکستان بنگلہ دیش میں سامنا کر رہا تھا جہاں عوام سے زیادہ مکتی باہنی کی تربیت یافتہ دہشت گردوں سے پاکستان کی عوام پر نبرد آزما تھی۔ یہ افراد پاکستانی افواج پر حملوں کے بعد ہجوم میں پناہ لے کر پاکستانی افواج پر حملوں کے لیے دردِ سر بنے ہوئے تھے۔ آئرلینڈ برطانوی فوج کے ظلم و ستم کے حوالے سے "شوقِ آوارگی" میں موجود ہے۔

> "ہاں میں آئرش ہوں مگر مجھے برطانیہ سے اس لیے نفرت ہے کہ اس نے اقوامِ عالم کا سب سے زیادہ خون چوسا ہے"۔ شرابی اسی غیض و غضب کے عالم میں جواب دیتا ہے نیگرو طالب علم مسکراتے ہوئے کہتا ہے۔ "اگر میں یہی بات امریکہ کے بارے میں کہوں تو تم کیا محسوس کرو گے؟ کیا تم پسند کرو گے کہ واشنگٹن کو بم سے اڑا دیا جائے۔"(۲۲)

نیویارک سے پیرس تک سفر کے دوران جب عطاء الحق قاسمی کی دو خواتین ہم سفروں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کا تعلق مغربی پاکستان سے ہے تو ان کے چہروں سے بے زاری اور نفرت ظاہر ہوتی ہے۔ عطاء الحق قاسمی یہ

بیان کرنا چاہتے ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں ہونے والی پاک بھارت جنگ ہندوستانی پروپیگنڈا یورپی اور امریکی عوام پر کس طرح اثر انداز ہو رہا ہے۔ ایسوی ایٹڈ پریس آف انڈیا جنگ کے زمانے میں مغربی ممالک اور امریکہ میں پاکستان کی کمزور پوزیشن کو خراب کرنے میں پوری طرح حاوی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حق پر ہونے کے باوجود پاکستان دنیا کی نظروں میں بدنام ہو رہا تھا۔ عطاء الحق قاسمی نے بلا مبالغہ اس امر کی جانب ایک صریح اشارہ کیا ہے کہ آزاد میڈیا اور اخبارات کے ساتھ پروپیگنڈا کس طرح عوامی ذہن کو متاثر کرتا ہے۔

> ''تمھاری فوج کے ہاتھ بے گناہ بنگالیوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ کیا تم مغربی پاکستان ہونے کی حیثیت سے خود کو گلٹی محسوس نہیں کرتے؟ پرپلین کی آنکھوں میں غصہ تھا۔''(۲۳)

پاکستان کے حوالے سے سیاسی گفتگو کرتے ہوئے عطاء الحق قاسمی کا لہجہ مصلحانہ اور حقیقت پر مبنی ہو گا۔ وہ اپنے ملنے والوں پر بنگلہ دیش کی اصل صورتِ حال کو واضح کرتے ہیں اور مظلوموں پر سیاست کرنے کی بجائے پاکستانی سوچ کے بلند کردار کی عظمت کے ترانے گاتے ہیں۔

> ''نہیں! انڈیا میں تربیت یافتہ بکتی باہنی کے سپاہیوں سے نبرد آزمائی کے دوران یقیناً بے گناہ لوگ زیادتیوں کا شکار ہوئے، میرا دل ان کے لیے روتا ہے۔ مگر میں ان محب وطن افراد کو بھی نہیں بھول سکتا جنہیں مکتی باہنی نے اپنے مظالم کا نشانہ بنایا۔ ظالم کوئی بھی ہو، وہ ظالم ہے اور مظلوم کوئی بھی ہو، وہ مظلوم ہے۔ اس میں تفریق نہیں کرنا چاہیے، مجھے افسوس ہے کہ تمھارے پریس نے اس ضمن میں کھلی جانبداری کا مظاہرہ کیا۔''(۲۴)

اس صورتحال میں گفتگو کرتے ہوئے عطاء الحق قاسمی کے لہجے میں طنز اور تاسف کی ایک ایک جھلک نظر آتی ہے۔ وہ حکومت پاکستان کی ناعاقبت اندیشانہ پالیسیوں پر غیر محسوس انداز میں طنز کرتے نظر آتے ہیں۔ ایسے میں جب ہندوستانی حکومت ناکام جنگ کے باوجود کامیاب سفارت کاری اور پریس کی بہترین صورتحال کو پاکستان کے خلاف استعمال کرنے میں معروف تھی۔ جنرل ایوب خان کو اس صورتحال کے متعلق احساس نہ تھا۔ عطاء الحق قاسمی کے بیشتر یورپی سفر ٹرین میں ہی ہوئے ہیں۔ اس سے ٹرین کی اہمیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ امریکہ کے

برعکس یورپی ممالک میں ٹرین دور فتادہ جگہوں جانے کے لیے بہترین سواری تسلیم کی جاتی ہے۔ یورپ میں ٹرینوں کا نظام بھی پاکستان کی نسبت کہیں زیادہ جدید اور برق رفتار ہے۔ پاکستانی اور ترقی افراد ایک دوسرے سے زیادہ محبت اور خلوص کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ترک کے دورِ حکومت میں ترقی میں عربی رسم الخط پر پابندی عائد کی گئی تھی اس کی جگہ رومن رسم الخط کو متعارف کروایا گیا تھا۔ رسم الخط کا یہ طریقہ صرف زبان کی حد تک ہی محدود نہ تھا بلکہ مذہب کتب حتیٰ کہ قرآن مجید اور احادیث مبارکہ کو بھی مذکورہ رسم الخط میں لکھا گیا۔ مذہب سے دوری کے لیے ترکی میں پردے اور دیگر اسلامی تصورات اور رسومات پر مکمل پابندی عائد کی گئی۔ ترقی کا یہ سفر سیاسی پس منظر اس قدر خوفناک اور بالجبر تھا کہ ترکوں نے اس کے خلاف بغاوت کی۔ اس لیے جب مصنف نوجوان احمد کے پاس قرآن مجید کا ایک نسخہ دیکھ لیتا ہے تو اس کی وارفتگی اور خوشی دیدنی ہوتی ہے۔

اسی طرح یوگوسلاوین اور امیگریشن کے آفیسر یہ بات جانتے ہیں کہ پاکستان ایک ترقی یافتہ ملک ہے اور ایوب خان کے زمانے کی صنعتی ترقی کی پوری دنیا میں مثالیں دی جاتی تھیں اس لیے جب اُس نے پاسپورٹ پاکستان کے نام کو دیکھا تو ایوب خان کا نام لے کر پاکستان کی پہچان ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

> ”یوگوسلاوین امیگریشن آفیسر بھاری بھرکم جسم کا مالک تھا۔ اس کے چہرے پر گھنی بھوری مونچھیں تھیں اس نے چلتی ٹرین میں پاسپورٹ چیک کیا اور پھر اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ باہر پاکستان کا نام پڑھ کر اس نے اپنی نظریں تھوڑی دیر کے لیے وہاں جمائیں اور پھر پاسپورٹ مجھے لوٹاتے ہوئے کہا، ”ایوب خاں!“ ، ”یحیٰ خان! “ میں نے تصحیح کی وہ شاید نہیں جانتا تھا کہ ایوب خاں رخصت ہو چکا ہے۔
>
> ”ایوب خاں! اس بے جوش اور ولولے کے ساتھ انگلی اٹھا کر کہا۔ ”نہیں یحیٰ خاں! میں نے ایک بار پھر سمجھانے کے انداز میں کہا ”ایوب خاں! اس بار اس لہجے میں شدید جنجلاہٹ تھی۔“ (۲۵)

ترکی نے اپنے دورِ خلافت میں جہاں بے شمار کارہائے نمایاں انجام دیں اور یورپ کے بیشتر مشرقی حصے پر اپنے تسلط کو مضبوط کیا وہیں اسلامی دنیا میں موجود تبرکات اور دیگر قیمتی و تاریخی اشیاء کو استنبول کے توپ کاپی میوزیم میں منتقل کر دیا۔ یہاں برصغیر کی سیاسی تاریخ کا ایک بڑا واقعہ بھی مصنف کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص مصنف کو اس بات سے آگاہ کرتا ہے کہ ترکی کے اس میوزیم میں سلطان ٹیپو کا ایک خط موجود ہے جو اس نے انگریزوں کے خلاف مدد کے لیے اور ترکی کے زیرِ رقبہ لبرا کی بندرگاہ کو استعمال کرنے کی اجازت دینے کا مطالبہ کیا تھا۔ تاہم ترکی کے سلطان نے یہ خط برطانوی سفیر کو روانہ کر دیا۔ فرانسیسی سفیر نے سلطان ٹیپو کی مدد کرنے جبکہ برطانوی سفیر نے مدد نہ کرنے کا مشورہ دیا جس پر عمل کرتے ہوئے ترکی کے سلطان نے سلطان ٹیپو کی مدد نہیں کی۔ اس واقعہ کے پس منظر کو بیان کرنے کا مقصد مسلمانوں کی بے حسی کے ساتھ ساتھ ان کی سیاسی حکمت عملی پر بھرپور طنز ہے۔ سلطان سلیم ترکی کی خلافت میں ایک روشن چراغ کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی معاملہ فہمی اور جاہ و جلال کو ایک دنیا تسلیم کرتی ہے۔ لیکن ایک سلمان بادشاہ کی مدد کرتے ہوئے اس کی عقل سلیم کو گرہن لگ جاتا ہے۔ اس واقعہ میں طنز اور تاسف دونوں موجود ہیں اس واقعہ میں مصنف نے ذہنی کیفیت کو جسمانی کیفیت کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا ہے۔

> "ہاں، برطانوی سفیر کو بھی! منور ٹھنڈی سانس بھر کر کہتا ہے۔ وہ اب واقعی سنجیدہ نظر آنے لگا ہے۔" برطانوی سفیر نے اس خط پر لکھا کہ سلطان ٹیپو ایک ڈاکو اور لٹیرا ہے۔ اس کے ساتھ قطعاً کوئی تعاون نہ کیا جائے جب کہ فرانسیسی سفیر نے پرزور سفارش کی کہ سلطان ٹیپو کی مدد کی جائے!
>
> "پھر کیا ہوا؟ مجھے اپنی سانس رکتی محسوس ہوتی ہے۔
>
> "پھر وہی ہوا جو انگریزی سفیر نے کہا تھا۔" منور کے لہجے میں کپکپاہٹ سے "ٹیپو شہید کو جواب موصول ہوا کہ انگریز ہمارے دوست ہیں، آپ بھی ان سے دوستی کریں۔ دوسری طرف بصری کے گورنر کو ہدایت کی گئی کہ بصرے کا دماغ پہلے سے دوگنا کر دیا جائے!

میں ایک پھر چلتے چلتے اپنا اٹیچی کیس زمین پر رکھتا ہوں اور سانس لینے کے رک جاتا ہوں۔ اس دفعہ تھکاوٹ کا احساس پہلے سے کہیں زیادہ ہے مجھے یوں لگتا ہے جیسے کوئی ہوے ہوے مجھے کند چھری سے ذبح کر رہا ہے۔ خادموں کا رول ادا کرنے والے کردار الش اور اش چری آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتے ہیں۔"(۲۶)

شوقِ آوارگی میں عطاء الحق قاسمی نے سوشل ازم اور کیپیٹل ازم کا موازنہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں یہ دونوں نظاموں کو انسان کی فلاح کے لیے بہترین نہیں سمجھے جاتے۔ انھوں نے دورانِ سیاحت میں یورپ اور امریکہ کے ممالک کی سیر کے دوران ان نظاموں کا جائزہ لیا۔ جس کا اثر انسانی زندگی پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ اس لیے وہ کیپیٹل ازم کو ہولناک ترین نظام کہتے ہیں ان کے خیال میں مارکسی نظریات سے ہم استفادہ تو کر سکتے ہیں لیکن اصول نہیں بنا سکتے کیونکہ سوشلسٹ نظام اپنے اندر بہت سی برائیاں لیے ہوئے ہیں۔ اس لیے وہاں اسلامی اصولوں پر مشتمل سیاسی اور معاشی نظام کو برائیوں سے پاک سمجھتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"میرے نزدیک سوشلزم کیپیٹل ازم کے مقابلے میں کمتر برائی ہے۔ مارکس ایک درد مند انسان تھا اس کی تشخیص ٹھیک تھی لیکن علاج میں خامیاں تھیں ویسے میں دیانتداری سے یہ محسوس کرتا ہوں کہ ان دونوں نظاموں کے مقابلے میں انسانیت کو ایک تیسرے نظام کی ضرورت ہے؟۔۔۔۔۔ مرے خیال میں اس کی بنیاد اسلامی اصولوں پر استوار کی جا سکتی ہے۔ اور اس نظام کی تفصیلات طے کرتے ہوئے ہم دوسرے نظاموں سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ یہ نظام جبر و اعتبار کی درمیانی شکل پر مبنی ہونا چاہیے۔ اور اس کا مقصد دنیا میں فلاحی مملکتوں کا قیام ہو، عمر فاروق کا دورِ حکومت میرا آئیڈیل ہے۔"(۲۷)

مصنف کا تعلق ایک کشمیری خاندان سے جو تقسیم سے قبل ہندوستان پنجاب کے معروف شہر امرتسر کا رہائشی کا تھا۔ ۱۹۷۷ء میں مصنف نے پہلی بار ہندوستان کا سفر ایسے وقت میں کیا جب وہ نومولود کی حیثیت سے گزر کر جوانی کی سرحد میں قدم رکھ چکے تھے چونکہ انہوں نے انتہائی کم عمر میں ہندوستان سے ہجرت کی تھی۔ اس لیے دوسری دفعہ سفر کرتے ہوئے کم سنی کے ہندوستان کے نقوش ان کے ذہن میں کسی حد تک موجود تھے۔ ہندوستانی پنجاب سے سفر کے دوران مصنف کا ذہن مسلسل ماضی میں پرواز ہے۔ اُسے ان راستوں میں ٹرینیں دکھائی دیتی ہیں جو لاشوں سے زخمیوں سے اٹا اٹ بھری ہوئی پہنچی تھیں اور پاکستان میں مہاجرین کی دیکھ بھال کا کوئی انتظام

موجود نہ تھا۔ نسل در نسل وقت گزرتے ہوئے بھی مصنف کے ذہن میں وہ تلخی بر قرار تھی جو روایتی سیاست دانوں نے بر قرار پر امن تقسیم کی بجائے خون اور خرابے سے بھری ہوئی تقسیم بنایا تھا۔ سیاست کا یہ طریقہ نہایت گھناؤ اور تاریک بھی ہے۔

> "شاید اس لیے کہ یہ وہ راستے تھے جدھر سے ۱۹۴۷ء میں خون میں ڈوبے ہوئے قافلے گزرے تھے۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء میں ان راستوں سے بارود کی چنگاریاں میرے وطن کی طرف لپکی تھیں۔ اور ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۷ء میں ایک عجیب قسم کی پر اسراریت اور شک و شبہ کی گرد فضاؤں میں موجود رہی اور یہی وہ فضا تھی جس میں میری نسل کے افراد نے شعور کی آنکھ کھولی۔ اس کے ساتھ ساتھ امر تسر سے میری جذباتی وابستگی کی لہر بھی ان لہروں میں شامل تھی جو اس وقت میرے ذہن میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔۔"(۲۸)

قیامِ پاکستان کے بعد ایک کمیشن بنایا گیا تھا۔ جس کے ایک رکن جسٹس صدیق چوہدری مغویہ عورتوں کی بازیابی کے لیے کوششوں میں مصروف تھے۔ ان کی گفتگو مصنف کے لیے روشنی کا ایک مینار ثابت ہوئی ان کے مطابق جب وہ پولیس کیس سپاہیوں کے ہمراہ کسی جگہ پر اترتے تو اغواہ شدہ عورت ان کے ساتھ جانے کی بجائے اپنے اغواہ کاروں کے ساتھ جانے کی کوشش میں تھی۔ انسانوں سے اس قدر ڈر انتہائی افسوس ناک اور دل خراش تھا۔ ان خواتین کا یہ رویہ انسانیت پر سے یقین اٹھا لینے والا ہوتا مصنف کے مطابق اگر دو قومی نظریے سے ناواقف کوئی شخص ظلم و ستم اور بربریت کی یہ داستان دیکھ لیتا تو دنیا کی کوئی طاقت اسے اس نظریے سے ہٹانے کی کوشش نہیں کر سکتی تھی۔ بدترین قتل و غارت گری میں ایسے کنویں اور جگہیں موجود تھیں جن میں اجتماعی طور پر قتل شدہ لوگوں کو دفن کیا گیا۔ جسٹس صدیق چوہدری ہمیں بتاتے ہیں کہ سڑک کی جانب ہرے بھرے کھیت دیکھ رہو جو کہ ۱۹۴۷ء میں مسلمان مردوں، بچوں اور عورتوں کے سروں کی سرخ رنگ کی فصلیں کاٹی گئی تھیں۔ وہ بتا رہے ہیں ہمیں عورت کے بیچارگی اور مظلومیت جیسے کئی روپ دکھائی دیتے ہیں لیکن یہ رخ ایسا ہے شاید کبھی نہ دیکھا ہو جس طرح میں نے دیکھا ہے۔ عطاالحق قاسمی ہمیں بتاتے ہیں کہ سب ان کی باتیں غور سے سنتے ہیں جسٹس صاحب میں ایک واقعہ سناتا ہوں۔

"جسٹس صاحب نے کہا! مجھے اطلاع ملی کہ ایک سید زادی کو ایک بھنگی نے اپنے گھر ڈالا ہوا۔ میں پولیس کے سپاہیوں کے ساتھ اس گاؤں میں پہنچا اور دروازہ توڑ کر گھر میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا صحن میں ایک بچی کھانا پکا رہی تھی اور ایک طرف جائے نماز بچھی تھی! اتنے میں دوسرے کمرے میں ایک ادھیڑ عمر کا کالا بھجنگا شخص باہر نکلا اور ہمارے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ یہ وہی بھنگی تھا جس کے متعلق اطلاع ملی تھی کہ اس نے سید زادی کو اغوا کر کے گھر میں ڈالا ہوا ہے۔ اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اُتر آیا میں نے آگے بڑھ کر ایک زور دار مکا اس کے منہ پر رسید کیا جس سے وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اس کے منہ سے خون جاری ہو گیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر بعد اٹھا اپنی قمیض کے دامن سے اپنا منہ پونچھتے ہوئے اس نے کھانا پکاتی لڑکی کی طرف کو اشارہ کیا اور کہا تم اسے لینے آئے ہو۔۔۔۔۔ تم ہمیشہ سکھی رہو اور پھر اس کے سر پر پیار دیتے ہوئے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں اور پھر وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔" (۲۹)

عطاء الحق قاسمی ہمیں اپنے سفر نامے میں بہت سے ایسے واقعات سناتے ہیں او وہ جگہیں بھی دکھاتے ہیں جب ۱۹۴۷ء میں خون کی ندیاں بہائی گئی تھیں۔ مصنف قصہ بر اس سناتے ہیں تو قاری کی آنکھیں مصنف کی آنکھوں کو دیکھ کر نم ہو جاتی ہیں۔ قصہ بر اس اس سفر نامے کا نچوڑ ہے جسے ہمیں یاد رکھنا چاہیے تا کہ ہماری غیرت کی چنگاری سلگتی رہے۔ عطاء الحق قاسمی ہمیں ان تمام واقعات کو سنا کر یہ بات بتانا چاہتے ہیں کہ قومی سلامتی، یکجہتی اور اجتماعی غیرت و حمیت کو زندہ رکھنے کے لیے ہمیں اپنی نوجوان نسل کو ان سے آشنا کروانا ضروری ہے تا کہ وہ احساس ذمہ داری سے ہمکنار ہو سکیں اور اپنے وطن سے محبت کریں اس کو دشمنوں سے محفوظ رکھیں اور اپنے وطن کی قدر کریں۔

عطاء الحق قاسمی سفر کے دوران ترک ملی طلبہ کے صدرِ دفتر جاتے ہیں تو انہیں دلی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ ایسی خوشی جو اپنوں کے مابین مذہبی شخصیت سی ہوتی ہے۔ جس کا ظاہر و باطن مکمل طور پر الگ ہے وہ داڑھی رکھ کر لوگوں کو بیوقوف بنانے میں ماہر ہے۔ ظاہر و باطن کا یہ تضاد جب مصنف پر ظاہر ہوتا ہے تو وہ اُسے دیومالائی

کردار کے حامل روسی جادوگر کے نام سے موسوم کر دیتا ہے۔ راسپوٹن تام کا یہ شخص ذاتی مفاد کے لیے مذہب کی آڑ استعمال کرنے اور لوگوں کو بیوقوف بنانے سے نہیں ہو سکتا۔ مصنف کو اس لبادے میں موجود ہمارے ملک کے ایسے سیاسی اکابرین کے شعبے کی طرف اشارہ کیا ہے جس کا ظاہر و باطن الگ الگ ہے۔

"راسپوٹین نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ میں کمیونزم پر لعنت بھیجتا ہوں۔ کھاؤ پیو عیش کرو جو ازم تمھیں یہ سب کچھ دے اس سے بہتر ازم کوئی نہیں ہے۔" (۳۰) طنز و مزاح کرنا عطاء الحق قاسمی کی گھٹی میں شامل ہے۔ یہ وہ عادت ہے جس سے انسان چاہ کر بھی نہیں چھوڑ سکتا لیکن ان کی ظرافت مبذال سے پاک ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر فوزیہ چوہدری کچھ یوں کہتی ہیں:

> "ان کی ظرافت لطیف و پاکیزہ ظرافت ہے۔ اس میں قدرے شوخی بھی ہے۔ مگر شوقیانہ پن بالکل نہیں ہے وہ اس لحاظ سے بھی ایک منفرد مزاح نگار ہیں کہ ان کے قلم نے زندگی کے کسی شعبے کو نظر انداز نہیں کیا۔ اگر کہا جائے کہ ان کا مزاح عوامی مزاح ہے۔ تو کچھ بے جا نہ ہو گا۔ کیونکہ مذہب و سیاست ریاکاریاں معاشرت کی بے ڈھنگیاں، سیاسی لیڈروں کی وعدہ خلافیاں، ماحول اور تہذیب و تمدن کے بے اعتدالیاں کچھ بھی ان کے حکم کی زد سے محفوظ نہیں رہ سکا۔" (۳۱)

"گوروں کے دیس میں" اگر سیاسی حوالے تلاش کیے جائیں تو ہر صفحے پر کوئی ایسا جملہ یا تمہید ضرور ملتی ہے۔ ان کے اس سفر نامے میں وہ مغرب میں رہنے والے باسیوں کی زندگی پر تنقید کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ہر قابل گرفت پہلو پر بات کرتے ہیں اور اس کے علاوہ وہ اپنے ملک کی سیاست اور معاشرت کو بھی نہیں بھولتے وہ ہمہ وقت ان کے لاشعور میں موجود ہوتا ہے۔ وہ پیرس یا لندن کی سیر کے دوران اپنے ملک اور یورپ کے قوانین کا موازنہ یورپ میں مقیم پاکستانیوں کی روزمرہ زندگیوں سے کرتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی نے اپنے اس سفر نامے میں لکھا ہے کہ اس دور میں پاکستان نے طویل مدت کے بعد جمہوریت کی طرف قدم بڑھایا تھا۔ جبکہ اس سے پہلے کے فوجی وغیرہ فوجی ادوار کی کارکردگیوں کا اظہار وہ طنز کے پیرائے میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

"جب بریک پر پاؤں رکھنا ہو بخش صاحب (۲۱) ایکسلیٹر پر پاؤں رکھ دیتے ہیں اور جب پاؤں ایکسیلیٹر پر ہونا چاہیے اس وقت بخش صاحب کا پاؤں بریک پر ہوتا ہے۔

ہاتھ برگ پر ہے نہ یا ہے نکاب میں

ساقی نے کچھ نہ دیا ہو شراب میں

تاہم بخش صاحب کا کمال فن یہ ہے کہ ان کا آج تک چالان نہیں ہوا جیسے ہمارے ملک کے صاحبانِ اقتدار کا کبھی چالان نہیں ہو سکا جو ملک اسی طرح چلاتے ہیں جس طرح بخش لائل پوری کار چلاتے ہیں۔" (۳۲)

عطاء الحق قاسمی مندرجہ بالا اقتباس میں اپنے ملک کے نظام کا اور اس نظام کو چلانے والوں پر گہرا طنز کرتے ہیں جس میں تاسف کی لہر ہی دکھائی دیتی ہے۔ مصنف کے ہاں یہ بات بھی دکھائی دیتی ہے وہ اپنے ساتھ قاری کو تفریح بھی کرواتے ہیں اور ساتھ ساتھ پیچیدہ پہلوؤں کی طرف متوجہ کروانے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ جہاں وہ کوئی طنزیہ جملہ کہتے ہیں وہیں قاری کو امید کی کرن دکھانے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی نے سرمایہ دارانہ نظام پر بھی کڑی تنقید کرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اس نظام انسان کو مشینوں کے تابع بنا کر اس کو اپنے شکنجے میں بری طرح جکڑ لیا ہے۔ اور اس نظام سے انسانوں میں حرص اور لالچ پیدا ہو گیا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی وجہ سے انسان نے چند آسائشوں کے لیے زندگی کی حقیقی خوشیاں قربان کر دیں ہیں۔ اب یہ نظام یہاں اپنی جڑیں مضبوط کر چکا ہے۔ اس کے اثرات کی وجہ سے امیر امیر تر اور غریب آدمی غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں اس نظام کے خلاف شدید نفرت دکھائی دیتی ہے۔

"آج سورج نکلا ہوا یہ تھا چنانچہ انگریز جامے سے باہر ہو رہے تھے۔ مردوں نے ہمارے بھاٹی گیٹ کے پہلوانوں کی طرح قمیض اتار کر کاندھوں پر ڈالی ہوئی تھی اور عورتیں حسبِ توفیق موسم کا لطف لے رہی تھیں۔ اتنے خوبصورت چہرے اور صحت مند جسم مگر ایک ایسے نظام کے شکنجے میں کسے ہوئے جس نے آغاز میں مشینوں کو انسان کا تابع بنایا لیکن اب

یہ مشینیں انسان کو موبل آئل کی طرح استعمال کر رہی ہیں۔ جس طرح قربانی کے جانور کا صحت مند ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح سرمایہ داری نظام میں انسانوں کا صحت مند ہونا ضروری ہے۔ تاکہ مشین کی کالی دیوی ان کی قربانی قبول کر سکے۔" (۳۳)

عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں مزاح کے ساتھ ساتھ طنز کی ہلکی اور کہیں گہری لکیر موجود ہوتی ہے۔ اگر ہم موجودہ دور کے سفر نامہ نگار مستنصر حسین تارڑ کے ساتھ ساتھ تقابل کریں تو ہمیں مستنصر کی تحریروں میں سنجیدہ اور جذباتی سطح دکھائی دیتی ہے جبکہ عطاء الحق قاسمی کے ہاں وہاں ایک اور نئی کیفیت ملتی ہے۔ جس میں مزاح کے ساتھ ساتھ حقیقت نگاری بھی نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

"عطاء الحق قاسمی مزاح کے دھیمے رنگوں کو اس قدر شوخ کر دیتے ہیں کہ ان کی کرچیاں آنکھوں میں چبھنے لگتی ہیں۔" (۳۴)

آسٹریلیا کی وسیع و عریض براعظم کے متعلق اپنی گفتگو کرتے وقت مصنف نے انگریزوں کی نو آبادکاری سے متعلق اپنی آرائش کی ہے۔ ان کے مطابق اس وسیع و عریض دلدل اور صحراؤں پر مبنی صحر میں اسیب او جینز کہلائے جانے والے انسان کہاں سے آئے مصنف کے مطابق وہ نسل اب تین لاکھ سے کم ہو کر ساٹھ ہزار رہ گئی ہے۔ مصنف گوروں کی متعصبانہ اور نسل پرستانہ پالیسی کا بہت سخت نقاد ہے جنھوں نے آسٹریلیا کے قومی جانور کینگرو کو بچانے کے لیے ڈیڑھ لاکھ مربع میل کا علاقہ مختص کیا ہے مگر آسٹریلیا کے اصل رہائشی باشندوں کو زمین تنگ کرنے اور انہیں صفیحہ ہستی سے مٹانے کی پالیسی پر کاربند رہنے میں انہیں کسی قسم کی شرمندگی محسوس نہیں ہوتی۔ انسانوں کے حوالے سے یہ انسان دشمن پالیسی نسل پرستی اور متعصب سیاست کی بدترین مثال ہے جس نے آسٹریلیا کے حقیقی باشندوں کے لیے اپنی سرزمین تنگ کر دی۔

"بادامی رنگ کی یہ مخلوق شہروں میں بھی ریلوے اسٹیشنوں کے قرب و جوار میں محنت مزدوری کرتی نظر آتی ہے۔ گورے انہیں دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ ان کے رویے سے یوں لگتا ہے کہ جیسے غاصب گورے نہیں بلکہ یہ مقامی باشندے تھے۔" (۳۵)

دنیا خوبصورت ہے میں سنگاپور کے سفر کے دوران عطاء الحق قاسمی اور وفد میں شامل ان کے ساتھی قیوم صاحب کے درمیان ملکی پسماندگی کی وجوہات پر کچھ اس طرح بات چیت شروع ہوتی ہے۔ جس سے عطاء الحق اپنا نظریہ سیاست کچھ اس طرح واضح کرتے ہیں کہ ہمارے ہاں ایک مربوط نظام بننا چاہیے کیونکہ پسماندگی کا حل افراد پر نہیں بلکہ نظام پر منحصر کرتا ہے۔ نظام چلانے والوں کے تبدیل ہونے سے پالیسیاں تبدیل نہ ہوں۔ نظام کو چلانے کے لیے ایک عام آدمی کا ہونا ضروری ہے۔ وہ اس لیے ایک نچلے طبقے کا آدمی ہی ایک عام آدمی کے مسائل کو سمجھ سکتا ہے۔ نہ کہ سرمایہ دار طبقے سے جنھیں نچلے درجے کے طبقے کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

> "تو گویا آپ کے خیال میں معروف جمہوریت ہی ہمارے مسائل کا حل ہے؟ قیوم صاحب نے پوچھا؟ یقیناً! لیکن معروف جمہوریت نہیں حقیقی جمہوریت، وہی جمہوریت جس میں کاشت کاروں کی نمائندگی ان کے حقوق غصب کرنے والے جاگیر دار نہ کریں، مزدور کا نمائندہ مزدور دشمن نہ ہو اور تعلیم یافتہ افراد کی ترجمانی جہلا کے ذمے نہ ہو، جس میں جمہور کو انتخاب کرنے کے علاوہ انتخاب لڑنے کی سہولت بھی حاصل ہو۔" (۳۶)

عطاء الحق قاسمی "دنیا خوبصورت ہے" میں سیاحت کے ساتھ ساتھ سیاسی موضوعات کو بھی زیر بحث لاتے ہیں تاکہ سفر نامے میں قاری کے لیے تفریح اور تفکر کا سامان کے ساتھ فراہم کیا جاسکے۔ مصنف جب ایسے موضوعات پر آتے ہیں تو سفر نامہ نگار کے بجائے کالم نگار کا قلم حرکت میں آجاتا ہے۔ وہ طنز و مزاح کی تکنیکس کو برتتے ہوئے مشرقی و مغربی اقدار ملکی اور بین الاقوامی سیاحت کے فکر انگیز پہلوؤں کو قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ خاور نوازش کہتے ہیں:

> "دنیا خوبصورت ہے" کے ساتھ ہی عطاء الحق قاسمی کی سفر نامہ نگاری کا سفر مکمل ہو جاتا ہے۔ اس صنف کے فنی تقاضوں کو سامنے رکھا جائے تو ان کے چاروں سفر نامے گو کہ سفر نامہ نگاری کی روایت میں ایک ایسے مقام کے حامل نہیں ٹھہرتے لیکن ان کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ کے سیاحت کے ساتھ سیاسی اور سماجی شعور کی کارفرمائی کی عمدہ

مثالیں ہیں۔ کوئی ایسا سفر نامہ نگار نہیں جس کے سفر ناموں میں بھی ملکی سیاست پر طنز و مزاح کی تکنیک استعمال کرتے ہوئے ایسے شگفتہ تجزیے اس انداز میں مل سکیں جسے عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں ملتے ہیں۔"(۳۷)

عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں سیاحت کے ساتھ ساتھ سیاست بھی، نظر بھی ہے اور جنم بھی ہے قہقہے بھی کرب بھی، گزر اور بسر بھی اور لطف کی بات بھی موجود ہے۔ ان تمام چیزوں کو عطاء الحق قاسمی نے اپنے سفر ناموں میں اتنی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ ان سب کے باوجود ان سفر نامے کی مجموعی فضا، تاثر اور معیار کہیں بھی متاثر نہیں ہوتے۔ عطاء الحق قاسمی کو سفر نامہ نگاری کی روایت میں انفرادیت حاصل ہونے کے لیے ان کا ایک ہی سفر نامہ کافی تھا۔

ج: معاشی صورتحال پر طنز

جب ہم اقتصادیات کی بات کرتے ہیں تو اس سے ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی ملک یا خط اپنے رہنے والوں کی خوراک، لباس، رہائش اور تعلیم و صحت کے متعلق ضروریات کس حد تک نبھانے میں کامیاب کیونکہ انسان ہونے کے ناطے انسانوں کی بنیادی ضروریات ایک جیسے ہیں۔ اقتصادیات یا معاشیات کا دائرہ کار انسانی زندگی کے تمام اہم پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ جب کوئی سفر نامہ نگار جب کوئی دوسرے ملک کا سفر کرتا ہے تو کھانے پینے سے لے کر طرزِ رہائش تک بیشتر اشیاء کا اپنے ملک کے ساتھ غیر محسوس تقابل شروع کر دیتا ہے اور اس کی مدد سے غیر ارادی طور پر اس ملک کی اقتصادی حالت کو بیان کرنا شروع کر دیتا ہے۔ موجودہ سائنسی دور میں کیونکہ صنعتی ترقی میں بے پنا اضافہ ہو چکا ہے۔ اس لیے انسانوں کے پاس موجود آمدورفت اور بجلی و گیس جیسی ضروریاتِ زندگی کا ہونا لازمی ہو چکا ہے اویہ تمام چیزیں انفرادی اور اجتماعی معاشی صورتحال کو بیان کر دی ہیں۔

مذہب اور معاشرت دو ایسے عوامل ہیں جو انسان کے نظریات اور افکار کو تشکیل دینے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں دینِ اسلام کو ایک ملت قرار دیا گیا ہے جو حیاتِ انسانی کے تمام ضوابط سے متعلق احکامات جاری کرتے ہیں۔ اس لیے دنیا کا کوئی بھی اسلامی ملک ہو ان کے طرزِ حیات میں اشتراکات کی ایک بڑی تعداد سامنے آتی ہے اور اسی طرح غیر اسلامی ممالک میں بدترین مخالفتوں کے باوجود طرزِ زندگی میں کئی اشتراکات سامنے آتے ہیں۔

کسی بھی ملک کا معاشرتی نظام وہاں کی معیشت کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے امریکہ اور یورپ سمیت مشرقی بعید کے ممالک سنگاپور اور تھائی لینڈ جیسے ممالک کی اقتصادی حالت کے بیان کے پس منظر میں ان کی معیشت کی بنیادوں کو کھوجنے کی کوشش کی ہے جو ایک کامیاب طریقہ ہے۔ چونکہ انسانوں کے اعمال ان کی اقتصادی حالت کی کہانی بیان کرتے ہیں مثلاً یورپ اور مشرقی بعید کے ممالک میں شراب نوشی اور شراب فروشی سمیت جسم فروشی کے اڈے فقط پیسہ کمانے کے ذرائع ہیں جو ان کے لیے ایک معمول کے ذرائع میں سے ایک ہیں۔ لیکن ایک مسلمان کے لیے ان پیشوں کا اختیار کرنا کسی اسلامی ملک میں اگر نہ ممکن نہ بھی ہو تو حد مشکل ضرور ہے۔ کیونکہ پورا معاشرہ یکسو ہو کر اس شخص کا معاشرتی بائیکاٹ کرتا ہے اور ان کے لیے معاشرے میں جینا محال کر دیا جاتا ہے۔ مغربی ممالک میں صورتحال اس کے برعکس ہے جہاں اعلیٰ ترین انسانی اقدار اختیار کرنے کا بنیادی سبب صرف اور صرف مادی فوائد کا حصول ہے۔

عطاء الحق قاسمی ایک پاکستانی ہونے کی بنا پر اقتصادی حالت کے بیان کے پس منظر میں معاشرت اور معیشت کے پسِ پشت موجود سماجی حالات کو ایک دوسرے سے مربوط کرتے ہیں وہ کامیابی کے لیے صرف اقتصادی حالت کی بہتری کا پیمانہ نہیں بتاتے بلکہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ وہ معاشرت کے اصولوں کو اس طرح بیان کریں کہ وہ انسان کو روحانی اور مادی ہر دو اعتبار سے کامیاب دیکھ سکیں۔

بنکاک جسم فروشی اور شراب کے حوالے سے پوری دنیا میں شہرت رکھتا ہے۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ہونے والے سیٹو، سینو معاہدوں کی وجہ سے جنوبی اور مشرقی بعید کے ممالک کو امریکی فوجی سازوسامان کی فراہمی کو ممکن بنایا تھا۔ درحقیقت یہ دونوں معاہدے مشرقِ بعید اور جنوبی ایشیا کے چند ملک پر مشتمل ایک ایسا اتحاد تشکیل دیا جاتا تھا اور سرمایہ دارانہ نظام کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ اسی زمانے میں چند ہزار فوجیوں پر مشتمل دستوں انتہائی پسماندہ ملک میں تعینات کیا گیا سیٹو اور سینو معاہدوں کا ہیڈ کوارٹر بنکاک میں واقع تھا۔ امریکی حکومت اپنے مفاد کے تحت تھائی لینڈ کے ریلوے نیٹ ورک اور ٹیلی فونک نظام کے جدید بنیادوں پر استوار کر دیا۔ مزید برآں تھائی لینڈ کی حکومت امریکی اور یورپی اتحادیوں کے لیے اپنے ملک کو جنس کی سستی منڈی میں تبدیل کر دیا۔ جنس

اور مخرب اخلاق اشیا سے بھرا یہ ملک آج بھی ان کاموں کی وجہ سے عالمی شہرت کا حامل ہے۔ عصمت فروشی کے کلب تھائی لینڈ کی کمائی سیاحوں کو اپنی جانب راغب کرنے کا آسان طریقہ ہے۔ یہ تھائی لینڈ کی معیشت میں بہت بڑے حصے کا حامل ہے۔ مصنف نے اپنے سفر تھائی لینڈ کی معیشت کے پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔

> "بنکاک کو بین الاقوامی "ہیرا منڈی" کی حیثیت حاصل ہے۔ پوری دنیا سے سیاح یہاں ایڈز خریدنے آتے ہیں اور واپسی پر اپنے پیاروں میں تقسیم کرتے ہیں۔ عصمت فروشی گولیاں "سمال انڈسٹری" کی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ گھر گھر میں چھوٹے چھوٹے "یونٹ" قائم ہیں۔ جہاں چھوٹے چھوٹے بچے بھی بطور ایندھن استعمال ہوتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہان امرد پرستی کا بازار بھی گرم ہے۔ یہ بات بھی محاورتاً نہیں کہی جاسکتی بلکہ یہاں امرد پرستی کا بازار بھی گرم ہے۔ یہ بات میں نے محاورتاً نہیں کہی بلکہ اس مقصد کے لیے واقعی خصوصی طور پر ایک بازار موجود ہے۔" (۳۸)

ترقی پذیر عوام کی اقتصادی حالتِ زار کی اصل وجہ مسائل کی کمی نہیں بلکہ صحیح راستہ دکھانے والی قیادت کا فقدان ہے۔ سنگاپور کے سفر کے دوران مصنف پر یہ بات آشکار ہوتی ہے کہ سنگاپور کی اصل ترقی، عیاشی کے اڈوں کے ساتھ ساتھ ان اقوام کی دولت کا سنگاپور میں ہونا ہے جن کی بدعنوان قیادتیں اپنے ملک کا پیسہ لوٹ کر سوئزرلینڈ، لیکسمبرگ اور امریکہ یا بنگلور جیسے ممالک کے بینکوں میں رکھتے ہیں۔ یہ پیسہ غیر اقوام کی معاشی خوش حالی کا بنیادی سبب ہے۔

> "دراصل سنگاپور کی اقتصادی حیثیت کا انحصار عیاشی کے اڈوں، دنیا بھر سے آئے ہوئے بین الاقوامی جاسوسوں، مختلف ممالک سے بھاگ کر یہاں پناہ لینے والے مجرموں اور آمدنی کے اس نوع کے دیگر ذرائع پر ہے۔ سنگاپور کی حکومت ان طبقوں کی دولت سے اپنی معیشت کو مضبوط بھی بناتی ہے لیکن انہیں اپنے قانون کے دائرے سے باہر بھی نہیں جانے دیتی۔" (۳۹)

جاپان میں سفر کے دوران جب ان کی نظر جاپانی طلبہ اور طالب پر پڑتی ہے تو وہ معیشت اور معاشرت کے مابین تعلق کو بیان کرتے ہیں۔ ان کے مطابق معیشت کی ترقی رویوں کو درست کرتے ہیں۔ ممد و معاون ثابت ہوتی ہے تاہم مصنف کے مطابق جب یہ کمپلیسکز دور ہوتے ہیں بعض اوقات مشرقی اقدار کو ختم کرنے کا سبب بھی بنتے ہیں۔ جاپانی طلبہ اور طالبات کے کمپلیکسز Complexes سے آزاد زندگی مصنف کی وسعتِ نظری کی بہترین دلیل ہے۔

> "اس وقت ہمارے برابر سے جاپانی لڑکے لڑکیوں کا ایک غول گزر رہا تھا، یہ کالج کے طلبہ و طالبات تھے اور تفریح کے لیے اتنا طویل سفر طے کر کے یہاں پہنچے تھے۔ جب کوئی قوم آٹے دال کی فکر سے آزاد ہوتی ہے۔ اس کے سارے کمپلیکسز (Complexes) بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ ہمارے بچے گھر میں آئے ہوئے مہمان کے سامنے کچھ اتنا لجاتے شرماتے ہیں کہ تبدیلی جنس کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ اس کے اس لجانے اور شرمانے میں بزرگوں کے ادب کا اتنا دخل نہیں ہوتا جتنا حوصلہ اور ہمت کی کمی کا ہوتا ہے۔ جو معاشیات کی تابع اخلاقیات کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جاپانی بھی مشرقی لوگ ہیں۔ لیکن جب سے ان کی معیشت مضبوط ہوتی ہے، ان کی وہ شرم اور جھجک ختم ہو گئی ہے۔ جو شرقیت کا نہیں نفسیاتی پیچیدگیوں کا نتیجہ ہوتی ہے، بس دعا یہ کرنی چاہیے کہ وہ کہیں اہلِ مغرب کی طرح "بے شرم" نہ ہو جائیں۔" (۴۰)

آسٹریلیا اور یورپ کے اسفار کے دوران مصنف نے بے بہا نعمتوں کے افراط پر انگشت نمائی کی ہے۔ اان کے مطابق فائیو سٹار ہوٹلوں میں اکثر اوقات کھانے پینے اور دیگر اشیاء کی اتنی افراط ہوتی ہیں کہ غصہ آتا ہے وہ کہتے ہیں کہ افراط کا یہ عالم بالکل غلط ہے جہاں معدودے چند افراد دنیاوی رزق کے وسیلوں کے قابض ہو کر دنیا کی بیشتر آبادی کو محروم طبقات میں شامل کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امیروں کے لیے غریبوں کے دل میں کوئی جگہ موجود نہیں اور اگر غریب طبقے کو امراء کی ان عیاشیوں کا اندازہ ہو جائے تو ان کے ہاتھ امراء کے گریبانوں تک پہنچ جائیں۔ یورپ میں سرمایہ دارانہ نظام کی بدولت متوسط اور غربت کی لکیر کے نیچے بسر کرنے والوں کی نسلیں اور بچے اپنا اندرونی کرب چھپائے خاموشی اور بے بسی کے عالم میں امیروں کے لیے سامانِ راحت پیدا کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔

"ازدواجی زندگی کا کوئی تقدس نہیں رہا، طلاق روزانہ کا معمول ہے۔ جس کے نتیجے میں بچے نظر انداز ہوتے ہیں اور ان کے شعور اور لاشعور میں غصہ پروان چڑھتا ہے۔ فیملی سسٹم کے علاوہ تشدد کی یہ لہر صنعتی ترقی کا بھی نتیجہ ہے۔ ترقی کی یہ قیمت ہر اس معاشرے کو دینا پڑتی ہے جہاں صنعت کار اپنی مصنوعات بیچنے کے لیے اشتہار بازی سے مطمئن دلوں کو مضطرب کرتا ہے۔ لوگ ان اشیاء کے غلام ہو جاتے ہیں اور فیکٹریوں کا ایندھن بن جاتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں بچے والدین سے جدا ہو جاتے ہیں۔ والدین کی شفقت سے محروم یہ بچے اپنا اندرونی غصہ ایک دوسرے پر بھی نکالتے ہیں۔" (۴۱)

آسٹریلیا میں دلدلوں اور کانٹے دار جھاڑیوں پر مشتمل ایک وسیع و عریض خطہ ماضی میں یہ ملک اپنی انتہائی خراب معاشی حالت کی بنا پر یورپی نو آبادکاروں کی نظروں سے پوشیدہ رہا ہے۔ صرف ایک انگریز جہازران جمیز کک کو یہاں دلچسپی محسوس ہوئی اور اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں سونے کی کانوں کے دریافت کے بعد یہاں شہروں میں ترقی کرنا شروع کر دی۔ آسٹریلیا کے مقامی باشندوں کو زور بازو ان کے علاقوں سے نہ صرف نکال دیا گیا بلکہ انہیں بے رحمانہ طریقے سے قتل کیا گیا یہاں کی انگریز حکومت نے آبادکاری کے لیے افریقی اور ایشیائی ممالک سے غلام لا کر یہاں آباد کیا۔ مصنف نے جب ایک قیدی کو زنجیروں میں جکڑے زخموں سے چور حالت میں دیکھا تو اُسے پتہ چلا کہ آسٹریلیا کی ترقی اور معیشت کی تیز رفتار پیش رفت ہے۔ انگریز نو آبادکاروں کے ظلم و ستم اور مشرقی اور افریکی اقوام کے ساتھ رکھے گئے ظلم و ستم کا بڑا ہاتھ ہے۔ یہاں ان کے بظاہر خوبصورت ظاہر کے برعکس ان کے بدترین باطن کا پتہ چلتا ہے۔ مصنف نے غیر محسوس طور پر یورپی اقوام کی اس نو آبادکاری کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ جس نے لاکھوں انسانوں کو نہ صرف غلامی کی زنجیروں میں جکڑا بلکہ انہیں انسان کی اعلیٰ ترین حیثیت سے گرا کر رینگنے والے کیڑوں سے مماثل کر دیا۔ یہ خوبصورت اور مہذب جمہوریت کے بدترین باب کا اصل چہرہ ہے جس سے اکثر ناواقف دھوکا کھا جاتے ہیں۔

آسٹریلیا کی معیشت ۱۹۵۰ء سے قبل زیادہ تر زرعی معیشت پر مبنی تھی جس پر پیش رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس ملک کی موجود طاقتور معیشت میں زراعت کا کردار نہایت اہم ہے۔ آسٹریلیا اون، گوشت، دودھ اور پنیر سمیت اجناس کی پیداوار میں پوری دنیا میں نہایت ممتاز مقام رکھتا ہے۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں سفر کرنے والے لوگ جب اس وسیع و عریض مقام تک رسائی حاصل کرتے ہیں ان کے شہریوں کی ہر ممکن کوشش ہوتی تھی کہ وہ سیاحوں سے زیادہ سے زیادہ پیسے لے کر یہاں کی معیشت کی مضبوطی کا سبب بنیں گے۔ بس میں سفر کے دوران ایک ہمسفر خاتون اپنے ملک کی معیشت کے حوالے سے یوں گویا ہوتی ہے۔

> ”جس میں کچھ شاپنگ سینٹر دکھائی دیتے تو پولنڈ انے کہا! امید ہے آپ یہاں شاپنگ کر کے آسٹریلیا کی معیشت کو سہارا دیں گے۔“ (۴۲)

لندن میں سفر کے دوران مصنف کو ایک سپر سٹور میں جانے کا اتفاق ہوتا ہے سرمایہ دارانہ نظام میں سپر سٹور ایک ایسی بلا ہے جہاں ضروریات زندگی کی کم و بیش ہر چیز موجود ہوتی ہے۔ انگریز تاجروں نے لوگوں کی جیبوں کو کھلوانے اور انہیں خریداری پر مائل کرنے کے لیے ہر نوع کی تراکیب تیار کر رکھیں ہیں یہ کاروباری ہتھکنڈے انسانوں کو بے جا خرچ کرنے کی طرف ایک اہم ہتھکنڈا تصور کیا جاتا ہے۔ خوبصورت لباس میں موجود سیل گرلز اور سجاوٹ انسانی فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق کی جاتی ہے تاکہ مادہ پرست سرمایہ دار کو زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کا موقع دیا جا سکے۔ یہاں یہ رجحان اتنا خوفناک ہے کہ انسانوں کو مشینوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اور بقول مصنف کے اسے ایجنڈا بنا کر صرف اپنے اغراض و مقاصد کو پورا کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ یہاں مصنف ایک مشہور ڈرامہ نویس آئی نیسکو کے قول کا حوالہ دیا ہے۔ اس بدترین مادیت پرستی کے خلاف طاقتور آوازیں بھی انہی معاشروں سے بلند ہوتی ہیں جو ترقی اور پیسے کی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کے لیے مصنف نے آئی نیسکو کی اس بات کو دہرایا ہے جو ان کے ذہنی رجحان کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔

"آئی نیسکو نے اپنے ڈرامے رلیرس میں بتایا ہے کہ سفری رجحانات نے انسانوں کو گینڈوں میں تبدیل کر دیا ہے، لہر آدمی ذاتی اغراض کی دوڑ میں لگا ہوا ہے، اسے دوسروں کی کوئی پرواہ نہیں حتیٰ کہ محبوبہ بھی معاشرتی دباؤ کی وجہ سے گینڈی بن جاتی ہے۔" (۴۳)

"گوروں کے دیس میں" عطاء الحق قاسمی نے کھوکھلی تہذیب کے پردوں کو نہایت عمیق نظری سے دیکھا اور خوبصورت الفاظ اور نادر تراکیب سے چاک کیا ہے۔ ان کا یہ طرزِ تحریر قاری کو چونکا دیتا ہے۔ یورپ کی مثال ریاست کا جو تصور مشرقی ذہنوں میں بنا ہوا ہے وہ چکنا چور ہو جاتا ہے۔ تہذیب افرنگ کی ظاہری چکا چوند جھوٹ کے پردوں میں چھپا سچ ہے جس کی منظر کشی اس سفر نامے میں کی گئی ہے یعنی برائیاں اس خطے میں اپنے عروج پر ہیں۔ یکاڈ ہو، برمنگھم ہو، انگلینڈ ہو یا سوہو ہو سفر نامہ نگار کے پاس عقابی نگاہوں کا ہونا لازم ہے اور بعینہ اس سفر نامے میں قاسمی صاحب نے ذہن کے پردوں کے ساتھ ساتھ آنکھوں کو بھی پوری طرح وارا رکھا ہے جس کی بدولت قاری بھی خود کو شریک سفر محسوس کرتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی ایک سچے مشرقی ہیں۔ ان کے اس سفر نامے میں وطن سے محبت عیاں ہوتی ہے لیکن پھر انہوں نے چیزوں کو غیر جانب داری سے من و عن بیان کیا ہے۔ سکندر حیات لکھتے ہیں:

"گوروں کے دیس میں" مصنف اور اس کے دوستوں کے جگہ جگہ قیام کی لذتوں، جھومتے درختوں، گاتے ساحلوں اور اجنبی فضاؤں، چنگاڑتی سڑکوں، نہاتی گوریوں، چمکتی صحبتوں، ڈھلتی شاموں، ہنستے شہروں کو دل سے محسوس کیا اور ان تمام چیزوں کو مختلف زاویہ نگاہ سے دیکھا ہے۔ ان کا یہ سارا سفر خوش گوار قہقہوں میں ڈوبا ہوا مگر کبھی کبھی جب کوئی بات سفر نگار کے دل کو زیادہ ٹھیس پہنچاتی ہے ان کا لہجہ ذرا تیکھا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے دورانِ سفر ایسی عالمانہ باتیں کی ہیں۔ جن سے قاسمی صاحب کی سوچ اور مطالعہ کے بارے میں جاننا مشکل ہو جاتا ہے۔ انھوں نے یکجا سوچ کے ساتھ یکجا باتیں کی ہیں۔" (۴۴)

عطاء الحق قاسمی نے اس سفر نامے میں یہ بتایا ہے کہ جتنی عورت کی تذلیل اور استحصال مغرب والوں نے کیا۔ شاید ایسا کہیں بھی نہیں ہوا ہے۔ یہاں تک کہ مغرب عورت کے کچے گوشت کی نمائش بھی کی جاتی ہے۔ یعنی عورتیں شیشوں میں لگ جاتی ہیں گویا وہ عورتیں اپنے فطری لباس میں اپنی سہولیات کو ڈھونڈتی ہیں مصنف نے مغرب کی ہر طرح سے بگڑی ہوئی قدروں اور روایات کو بتانے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> "جس طرح ہمارے قصائیوں نے بکرے کی کھال اتار کر انھیں کھونٹی پر لٹکایا ہوتا ہے۔ اسی طرح اس علاقے میں مردوں نے عورتوں کو توہین اور ذلت کی کھونٹی پر لٹکایا ہوا ہے اور گہری مفکرانہ سوچ رکھتے ہیں۔" (۴۵)

مصنف نے مغرب کی دوغلی پالیسیوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ انھوں نے سرمایہ دارانہ نظام پر ایسی چوٹیں کی ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں۔ وہ سفر کے دوران جب مختلف نظاموں کی بگڑتی ہوئی صورتحال کو دیکھتے ہیں تو ان کے اندر ایک حساس اور دردمند مفکر انگڑائیاں لینے لگ جاتا ہے۔ سفر نامہ نگار وسیع النظر ہیں اس لیے صحت مند حافظہ ہی سفر نامے کی کامیابی کا باعث بنتا ہے۔ انھوں نے یہاں پر گہرا اثر کیا ہے جو ذہن انسانی کے بند قفل کھول دیتے ہیں جس نظام میں انسان حیوان بن جاتا ہے۔ اس کی ایک چھوٹی مثال کچھ یوں پیش کرتے ہیں۔

> "سفر کے گلے سڑے بدبودار نظام کے ہاتھ میں انسان کی حیثیت محض ایک کٹھ پتلی کی ہے اور اسے کٹھ پتلی کے لیے صرف یہ کیا گیا ہے کہ انسان کی فطری خود غرضی، ہوس اور لالچ کنٹرول کرنے کی بجائے اسے مہمیز دی جاتی ہے اور اس کی خواہشات کا دائرہ وسیع کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ دنیا میں پاکستان سمیت جہاں سرمایہ پرستی کا نظام نافذ ہے وہاں نکی اور مکی نئے کپڑے خریدنے کے لیے پہنے ہوئے کپڑے اتار دیتی ہیں۔" (۴۶)

عطاء الحق قاسمی نے اپنے سفر ناموں میں جگہ جگہ اخلاقی باختگی اور کلبز کے مناظرہ کا تذکرہ کیا تاہم ہالینڈ کا شہر ایمسٹرڈیم اس حوالے سے سب سے زیادہ شہرت رکھتا ہے۔ یہاں دنیا کا سب سے بڑا لائٹ ایریا موجود ہے۔ یہ کلبز یورپ میں بے حیائی کے کام کے فروغ کے ساتھ ساتھ زرِ مبادلہ کے ذخائر میں اضافہ کا باعث بنتے ہیں مگر اس کی وجہ سے انسانوں کو ایسی مشین میں تبدیل کرنے کی جانب قدم اٹھایا جائے جہاں صرف اپنی جسمانی ضروریات کو پورا کرنے پر توجہ مرکوز ہے۔

د: اخلاقی صورتحال پر طنز

ہر ملک اور خطے کے لوگوں کا اپنی زمین کی جغرافیائی صورتحال سے گہرا تعلق ہوتا ہے اور اسی کے مطابق رہن سہن، تعمیرات اور زبان کی تشکیل ہوتی ہے۔ عطاء الحق قاسمی اگرچہ امرتسر میں پیدا ہوئے ہیں مگر ان کی جوانی اور عمر عزیز کا بیشتر حصہ لاہور میں گزرا ہے۔ اپنے انتہائی مذہبی مگر رو دارانہ حیثیت کے حامل خاندانی پسِ منظر کے عین مطابق وہ چیزوں کو پرکھتے اور ان کا موازنہ کرتے ہوئے اپنے ذہنی پس منظر کے ساتھ پاکستان کے معاشرتی نظام کو ذہن میں رکھتے ہیں۔

اسلام ایک مخصوص ضابطہ اخلاق کا حامل مذہب ہے جس میں فروعی مسائل سے قطع نظر بنیادی اعتقادات اور مسائل پر تمام مکتبہ ہائے فکر کا نقطہ نظر کم و بیش ایک ہے یہی وجہ ہے کہ دور دراز کے خطوں میں رہنے والے مسلمان اوراق اور لباس اور رہن سہن میں تبدیلیاں رکھنے کے باوجود الگ پہچان کے حامل ہوتے ہیں اور دور سے نظر آتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام آج کل کم و بیش پوری دنیا میں رائج ہو چکا ہے۔ اس نظام میں انسان کے جذبات اور روح کے حاوی وسائل کے آگے کوئی حیثیت نہیں رہتی جبکہ مغربی ممالک کا پس منظر یہ نظام پوری خصوصیات کے ساتھ رچ بس چکا ہے یہ نظام سے بھیانک ذیلی مضمرات کا سامنا کر رہا ہے۔ اس لیے یہ نظام اخلاقیات کے مروجہ اصولوں کی بالکل پروا نہیں کرتا بلکہ نام و نہاد جمہوری چہرہ رکھنے اور اخلاقیات کے پیروکار ہونے کے باوجود مغربی لوگ مادیت پرستی میں سب سے بڑھ کر ہیں۔ عطاء الحق قاسمی دینی اور مشرقی تہذیب کے دلدادہ ہیں۔ وہاں پاکستان کے بنیادی مسائل سے بھی کماحقہ آگہی رکھتے ہیں اور مصنف نے اپنے تمام اسفار کے دوران اپنے پس منظر اور مشرقی اخلاقی قدروں کی مغربی اخلاقی قدروں کے بالمقابل موازنہ کی صورتِ حال کو قائم رکھا ہے۔ چنانچہ ان کے سفرناموں کو پڑھتے ہوئے ہمیں موازنہ کی یہ صورتحال ہر لحاظ سے دکھائی دیتی ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام انسان کو استعمال کرنے کی ایک مشین میں بدل دیتا ہے اور اخلاقی اقدار کو سامنے رکھتے ہوئے ان بدترین مادہ پرستانہ رویوں پر تنقید کرتے ہیں ان کی تنقید میں شدت کے بجائے سمجھانے کا پہلو موجود

ہوتا ہے۔ وہ کسی بھی تہذیب کی اخلاقی اقدار کو بیان کرتے ہوئے موازنے کے دوران ان کے اچھے برے پہلو بیان کرتے ہیں۔ اور اپنی رائے دینے کی بجائے فیصلہ قارئین کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں اور جزئیات کے بیان میں ان کا تقابل قابلِ دید ہوتا ہے۔ وہ بظاہر نہ آنے والے ان سماجی پہلوؤں سے بھی اخلاقیات کی بنیادوں کی کھوج لگاتے ہیں جو بظاہر نظر نہیں آتی یا نظر آنے کے باوجود کسی کا دھیان ان کی طرف نہیں جاتا۔

عطاء الحق قاسمی اپنے سفر نامے "شوقِ آوارگی" میں اپنے تجربے اور تربیتی پس منظر کے مطابق بازاروں کے مراکز کا تذکرہ کرتے ہیں۔ یہ بات حقیقت ہے کہ جب انسان اخلاقیات کے دائرے کو چھوڑ کر باہر قدم نکالتا ہے پھر اس کے لیے اس غلط راستے پر چلنے کی کوئی انتہا نہیں رہتی اسی طرح امریکہ سرمایہ دارانہ نظام میں بھوک اور ذہن کی بالیدگی کے لیے کسی قسم کا کوئی انتظام نہیں مگر انسانوں کو آرام اور آسائش سہولتوں سے بھرپور زندگی مغربی اقوام کا کوئی ثانی نہیں آزادی نسواں کے نام پر مبنی آزادی فروغ بدترین اخلاقی کمزوری کا ایک نیا رخ بتاتا ہے۔ جس میں تمام یورپ اور امریکہ کے ممالک بیک وقت مبتلا ہیں۔ اسی لیے اعضا جنسی پر مبنی بازار ان کی ذہنی آوارگی اور خلفشار کی ایک اچھی مثال ہے۔

> "مگر اس شریف النفس انسان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ایک وقت آئے گا
> جب دل و جان ہی نہیں، بازار سے ہر سائز کے جنسی اعضاء بھی خریدے جاسکیں گے،
> سہو خریدار۔ کم از کم یہاں تماشا دیکھنے والوں کا ہجوم تھا۔" (۴۷)

عطاء الحق قاسمی نے مغرب اور یورپ کی اخلاقی زندگیوں کے جو مناظر پیش کیے۔ مغرب تہذیب کا یہ بھیانک روپ دیکھ کر جس میں عورتوں کی کوئی عزت نہیں اور ان کی نوجوان نسل کیا سے کیا کرتی پھر رہی ہے؟ ان کے بازاروں میں فروخت ہونے والے یہ جنسی اعضاء سے سجے بازار پر ان کا گہرا طنز کیا ہے اور وہ کہتے ہیں یہ یورپ کی ترقی نہیں بلکہ صحیح معنوں میں سفر زوال کی طرف جارہا ہے۔

جب کوئی چیز وہ نئی دیکھتا تو ابتدا میں ولولہ زیادہ ہوتا ہے مگر آہستہ آہستہ ماحول سے آشنائی کرنے کے بعد اس کی حیرانی کی کیفیت ختم ہو جاتی ہے۔ اپنی فطرت کے عین مطابق مصنف نیویارک میں موجود اخلاقی اقدار کو ناقدر نظر سے دیکھتے ہوئے موازنہ کی کیفیت پیدا کرتا ہے وہ دراصل بتائے بغیر یہ سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ ہر قسم کی گھٹن اور پیسے کی کمیابی کے باوجود ہمارا معاشرہ اخلاقی اقدار کی پاسداری میں مغربی معاشروں میں کہیں

بڑھ کر پاکیزہ اور خوبصورت ہے اور ہمارے لوگ عورتوں کو عزت دیتے ہیں اور انہیں ناموس رکھ کر ان کی ناجائز ضروریات کے لیے باہر نکالنے کے قائل نہیں ہیں۔ اپنے کام میں غرق دوسروں کی طرف سے لاپرواہ امریکی معاشرت ان بنیادی اخلاقی رویوں سے مکمل طور پر محروم ہے۔

"اپنے لاہور اور کراچی میں ان سے بہتر سیمینار موجود ہیں۔ ویسے فلم دیکھنے کا لطف بھی اپنے ہاں ہی آتا ہے۔ ٹکٹ لینے کا ایڈوانچر! کامیابی پر احساسِ فتح! فلم میں شرع لباس میں ملبوس رقاصہ پر پبلک کا لٹو ہونا اور پھر ہدیہ ترک پیش کرنے کے لیے بڑھکیں لگانا اوپر سے انٹرویل کے دوران کوکا کولہ، نان کباب، گنڈیریاں اور مونگ پھلی والوں کی یلغار ۔۔۔ یہاں کیا ہے۔۔۔۔۔ ہر کوی حسینہ بغل میں دبائے بیٹھا ہے اور صرف قلم دیکھتا ہے یا پھر کوئی بھی تو نہیں دیکھتا۔" (۴۸)

نیویارک کو دنیا کا طاقت ور ترین کاروباری حق ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اسی وجہ سے یہاں زندگی کی تیز رفتاری پر ایک ہی عام متحرک جسم سڑکوں پر دوڑتی گاڑی بے تحاشا آمدورفت نیویارک کی زندگی کو انتہائی سفاک حد تک تیز رفتار بنا دیتی ہے جہاں کمزور اور جسمانی اور دماغی طاقت نہ رکھنے والے لوگ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں ان کا پرسانحال کوئی نہیں ہوتا۔ جدید مغربی زندگی میں بھی جب بچے اٹھاراں سال کا ہوتا ہے تو وہ خود مختاری کا اعلان کر دیتے ہیں تو اولاد اپنے بوڑھے ماں باپ کو علاج کے نام پر اولڈ ہوم میں داخل کروا دیتے ہیں۔ جس سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان لوگون کو اپنی زندگی میں درپیش مسائل کو حل کرنے میں آسانی ہو۔ اسی وجہ سے بیمار اور بوڑھے افراد معاشرے کے لیے ایک تربیتی مرکز میں بدلنے کی وجہ سے معاشرے پر بوجھ بن جاتے ہیں۔

"اس لہجے میں تجھے بوڑھے کی آنکھوں میں ویرانیاں تیرتی نظر آتی ہیں۔ اس نے اپنی کہنیاں میز پر ٹکائے ہوئے میری طرف دیکھا اور کہا! بیٹے اگر تم لوگ بھی صنعتی ترقی کے دور سے گزرو تو اس کی نعمتوں سے ضرور بہرہ ور ہونا، لیکن اس کے لیے ان نعمتوں کی قربانی نہ دینا جن کا کوئی بدل نہیں۔" (۴۹)

"Survival of the Fittest" وہ انگریزی محاورہ ہے جو جنگل کے قانون پر صادق آتا ہے۔ انسانی معاشرے جنگل کے قانون کی حیثیت نہیں رکھتے مگر بہترین اور قانون اور انصاف کے لیے مشہور، معاشرے بھی

بظاہر تو انسان کی ترقی اور فلاح کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مگر حقیقتاً یہ معاشرے بنیادی اصولوں سے محروم ایسے معاشروں کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں جو اپنی ظاہری خوبصورتی کے برعکس انسانیت کے بنیادی اقدار کے لیے تباہ کن ہیں۔ امریکا مغربی ممالک اور دنیا کے بیشتر جن میں مذہب اور معاشرے کو الگ کر کے دیکھا جاتا ہے۔ انسانیت کے سمرِ قاتل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ جس میں انسانیت کی کراہیں بلند ہو۔ کر چیخوں میں بدل چکی ہیں۔ جسم فروشی، شراب نوشی اور جوئے کی کھلے عام اجازت نے سرمایہ داروں کو مزید دولت سے نوازنے میں اہم کردار ادا کیا ہے تو دوسری جانب انسانوں کے بیشتر حصے کو بنیادی سہولت تک رسائی سے بھی محروم کر دیا ہے۔ نئی نسل میں یہ احساسِ محرومی جنم لے چکا ہے۔ یہ احساس انہیں رفتہ رفتہ بغاوت پر مائل کر رہا ہے۔ اور سرمایہ داری نظام کا یہ عفریت جس نے آبادی کے بیشتر حصے کو بنیادی سہولیات سے محروم کر دیا ہے۔ دنیا کے لیے ناسور کی شکل اختیار کر چکا ہے۔

> "الریک نے ہولے سے اپنا سر اوپر اٹھایا اور پھر بولے بھولے لہجے میں کہا! میں طوائف ہوں!! مجھے یوں لگا میری کرسی کے عین نیچے کوئی بم پھٹا ہو۔ میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا اور پھر کافی کا ایک گھونٹ حلق میں اتار کر سر کو کرسی کے ساتھ لگا دیا۔"
>
> (۵۰)

شراب نوشی جیسا کہ قبل مسیح مغربی معاشروں میں اس قدر رواج پا چکا ہے کہ لاکھوں اموات ہونے کے بعد بھی اس مرض سے چھٹکارا حاصل نہیں ہوا اور ذاتی مفاد کے لیے پوری دنیا کو داؤ پر لگانے کو صحیح عمل گردانا جاتا ہے۔ اخلاقیات کے مروجہ پیمانوں کے برعکس شراب نوشی ان معاشروں میں بری نہیں سمجھی جاتی بلکہ ہر خاص و عام اس موذی مرض میں نہ چاہتے ہوئے بھی مبتلا ہے۔ انسانیت کی پرزور ابلاغ اور ڈھنڈورا پیٹنے والے ان معاشروں میں اخلاق باختگی اور شراب نوشی کا یہ منفی پہلو ان کی نفسیاتی تضاد کا کھلا مظہر ہے مغربی ممالک کی چمک دمک سے متاثر مشرقی دنیا کے لوگ ان معاشروں کے بارے میں جو تصور رکھتے ہیں وہ حقیقتاً ایسا بالکل نہیں ہے جو ہمارے گمان میں ہوتا ہے۔ سرسبز و شاداب سیر گاہوں اونچی عمارات اور بل کھاتی سڑکوں کے ان مظاہر کے پشت پر ایسی حقیقتیں پنہاں ہیں جن کا نظر آنا ہر ایک کے لیے ممکن نہیں۔ عطاء الحق قاسمی کا رویہ ایک مشرقی تہذیب

کے دلدادہ ایسے شخص کا ہے جہاں اخلاقیات اور معاشرت کے وہ پہلو ہمیں نظر آتے ہیں جو خوش نما منظر کے پیچھے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات وہ مغربی اقوام کے کچھ پہلوؤں کو تجسیس بھی کرتے ہیں مثلاً قانون کی حکمرانی، صفائی و ستھرائی، وقت کی پابندی تاہم معاشرے میں مضمر وہ ہولناک پہلو جن کی وجہ سے انکا معاشرہ زمین سے الگ ایک مصنوعی معاشرہ نظر آتا ہے اور یہاں اس کو دکھانے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی کا انداز دلنشیں مگر وہ اخلاقیات پر مروجہ مشرقی اصولوں میر مو(بال برابر) انحراف نہیں کرتے۔ تمام مغربی اقوام میں معاشرتی اقدار مختلف ہیں۔ مگر لباس اور اصولوں کی پاسداری کے بہت سارے پیمانے یکساں نظر آتے ہیں۔

> "برابر والی میز پر ایک ادھیڑ عمر جرمن اور اس کی بیوی کھانا کھا رہے تھے۔ مرد نے کھانا کھاتے ہوئے جیب سے رومال نکال کر ناک پر رکھا اور زور سے "سو" کیا۔ یہ "سوں" کی آواز اس قدر زوردار تھی کہ ہم لوگوں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے بڑے اطمینان سے ایک بار پھر "سوں" کیا پھر وہی رومال جیب میں ڈال کر پہلے جیسی بکنیوئی کے ساتھ کھانا کھانے میں مشغول ہو گیا۔" (۵۱)

عطاء الحق قاسمی اس سفر نامے میں پاکستانی صورت کو ہر چیز میں ڈھونڈتے نظر آتے ہیں۔ وہ پاکستان کی صورتحال سے موازنہ، کسی کردار میں اپنے ہم وطن ہونے کا شائبہ وہ ہر چیز کو پاکستانی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ وہ جب تہذیبوں کا موازنہ کرتے ہیں وہ اپنے وطن کو کبھی باعث شرمندگی نہیں گردانا۔ اس کے متعلق فرحت وثیر اپنے مقالے میں لکھتی ہیں کہ:

> "ابن انشاء کے سفر نامے اپنی تمام تر شگفتگی کے باوجود اپنے معاشرتی رویوں پر شرمندگی محسوس کرتے ہیں جبکہ قاسمی شرمندہ ہونے کی بجائے سوچنے پر مجبور کرتے ہیں اور عمل کرنے کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں تاکہ ہم ماضی اور حال پر تاسف ہوئے بغیر مستقبل کا سامنا بہادری سے کرنے کے قابل ہو سکیں وہ ہماری اصلاح کر کے ہمیں بدلنے پر مجبور کرتے ہیں۔" (۵۲)

۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء میں جب خلافت عثمانیہ ختم ہوئی تو ترکی کے حصے بخروں کے بعد یورپی ممالک نے ان کے اوپر قبضہ کر لیا اور معطفیٰ کمال اتاترک ترکی کی اصل حدود کو بچانے میں کامیاب ہیں۔ مغرب سے متاثر کمال اتاترک ترکی کے معاشرے کو بدلنے کی تگ و دو کا آغاز کرتے ہیں۔ چونکہ سیکولرزم اور بے دینی پھیلانے میں کمال اتاترک نے زور زبردستی کا مظاہرہ کیا۔ اس وجہ سے ترکوں میں اسلام کے خلاف سے زور زبردستی کا مظاہرہ کیا۔

اس وجہ سے ترک میں اسلام کے خلاف چلنے والی اس تحریک کے لیے مناضرت میں اضافہ ہو گیا۔ ترکی میں زبان کے ساتھ ساتھ مذہبی حوالوں سے بھی دوراست تبدیلیاں کی گئیں اور قرآن مجید کو عربی کے ساتھ ساتھ رومی رسم الخط میں بھی چھاپا گیا۔ خواہش کے برعکس بے دینی کے پھیلاؤ میں سختی کرنے کی وجہ سے ترکوں کی اسلام کے ساتھ محبت میں اضافہ ہو گیا۔ ترک معاشرہ اسلام او مغرب کا حسین امتزاج ہے۔ یہاں اخلاقی اور تہذیبی لحاظ سے اسلام کے نظریات اور عقائد کی پیروی کی جاتی ہے۔ مگر دیگر معاملات میں مغربی اصول اور لباس پسند کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں پہلو ایک دوسرے سے متصادم ہیں مگر مغرب اور اسلام کے متصادم رویوں کے ترکوں نے بہت خوبی سے جوڑے رکھنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ معظمیٰ کمال نے مغرب نواز پالیسی پر ایک گہرا طنز کیا ہے۔

> "یعنی ترکی کے بڑے شہروں میں عورتیں اور مرد مغربی تہذیب میں سر سے پاؤں تک غرق نظر آتے ہیں عورتیں منی سکرٹ پہنتی ہیں، اخباروں میں کھلم کھلا عریاں تصویریں شائع ہوتی ہیں، بڑے شہروں میں شراب سرِ عام فروخت ہوتی اور پی جاتی ہے بلکہ ٹرینوں میں بھی دستیاب ہے، ترکی کا آئین مکمل طور پر سیکولر ہے۔ لیکن یہ ایک ناقابلِ فہم سی بات ہے کہ جو ترک مغربی تہذیب میں سر سے پاؤں تک غرق ہیں۔ وہ بھی جذباتی طور پر انتہائی کٹر مسلمان ہیں۔ اور ایسے مواقع پر یوں لگتا ہے جیسے ان جسموں میں روحیں کسی اور کی ہیں ! عدنان میندریس نے اتاترک کمال پاشا کے بعض ایسے اقدامات کو ریاستی سطح پر کالعدم قرار دیا تھا جو دین کی بنیادی روح سے متصادم تھے۔ چنانچہ وہ آج بھی ترکی کے چھوٹے شہروں اور قصبوں وغیرہ میں بے حد مقبول ہیں۔" (۵۳)

عطاء الحق قاسمی سرمایہ دارانہ نظام کے اس قدر خلاف ہیں اپنی نفرت کے بارہا اظہار کے باوجود برائیاں گنواتے ہوئے بعض نہیں آتے اور ہر موقع بہ موقع خیالات کی تنزلی کے پیچھے اس بھیانک نظام کی موجودگی کا برملا ذکر کرتے ہیں۔ مشرقی اقدار میں بہت سارے کام بغیر معاوضے کے اخلاقیات اور انسانیت کے تقاضوں کے مطابق انجام دیے جاتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں آج بھی ایسی اقدار موجود ہیں مالی طمع کے بغیر انسانوں کی خدمت کو اولین حیثیت دی جاتی ہے۔ مگر ایران کے مغرب سے متاثرہ سماج میں عام لوگ اپنی گاڑی کو بطور لفٹ استعمال نہیں کرتے ہیں اور لوگوں کو بغیر مالی فائدے کے کہیں نہیں لے کر جاتے طنز اور مزاح کی کیفیت میں عطاء الحق قاسمی نے ایران کے مادیت پرست معاشرے پر بالواسطہ ایک تبصرہ کیا ہے۔

"مجھے آمنہ کی صورت میں ایک گائیڈ تہران میں مل گیا، وہ مجھے اپنے ساتھ لیے پھرتی رہی اپنے گھر لے گئی۔ جب وہ واپس ہوٹل چھوڑنے کے لیے گھر سے نکلی تو ایک کار ہمارے پاس آکر رک گئی، صاحب کے پوچھنے پر آمنہ نے اسے بتایا کہ ہمیں ایمپائر ہوٹل جانا ہے۔ اس مرد شریف نے کار کا دروازہ کھولا اور کہا! بغر مائیدا (تشریف رکھیے!)۔ جب ہوٹل کے قریب اُترے تو آمنہ نے پرس میں سے کچھ پیسے نکال کر اُسے جو دیئے جو اس نے بہ عجلت اپنی جیب میں ڈال لیے۔ پتہ چلا کہ یہاں شرفاء پٹرول کا خرچ پورا کرنے کے لیے لوگوں کو لفٹ دیتے ہیں اور اس کا معاوضہ پورے اشراح صدر کے ساتھ قبول کرتے ہیں!۔"(۵۴)

مصنف یہاں یہ بتانا چاہتا ہے سرمایہ دارانہ نظام ایسا نظام ہے جہاں کچھ بھی بغیر پیسوں کے نہیں ہوتا۔ ہر سہولت کے لیے پیسے لیے جاتے ہیں وہ کام جو ہمارے مشرقی معاشرے میں بغیر صلہ مانگے کیے جاتے ہیں مادیت پرست معاشروں میں ان کی قیمت وصول کی جاتی ہے۔

عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں مزاح وظرافت کے ساتھ طنز بھی ملتا ہے۔ وہ طنز ومزاح سے قاری کو سوچ بچار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔۔۔۔ "دنیا خوبصورت" میں سنگاپور میں سفر کے دوران جب مصنف کو حلال اشیاء کی تلاش ہوتی ہے تو بہ ساختہ ان کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے اگر ہم کھانے پینے کے علاوہ بھی دنیا کے بقیہ معاملات میں حلال وحرام کے پیمانوں کو مدِ نظر رکھیں تو ہمارا معاشرہ جنت نظیر ہو جائے۔

"قرب وجور میں میکڈانلڈ ہی واقع تھا لہٰذا درویشوں کا یہ قافلہ میکڈانلڈ پہنچا۔ اب مسئلہ حرام حلال کا تھا۔ بیف اور چکن کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ یہ ذبیحہ ہیں یا نہیں حالانکہ مجموعی طور پر سنگاپور میں گوشت کا کاروبار مسلمان کے ہاتھ میں ہے لیکن "تقویٰ" کا تقاضا یہ تھا کہ فش سینڈوچ پر گزارا کیا جائے سو اسی فیصلے پر عمل کیا گیا اگر ہم کاروبار اور دیگر معاملات میں بھی حرام حلال کا اتنا ہی خیال رکھنے سے ایمان مضبوط اور بینک بیلنس کمزور ہوتا ہے۔ دراصل انسان مذہب کے صرف ان پہلوؤں پر عمل پیرا ہوتا ہے جو اسے "سوٹ" کرتے ہیں، مذہب کا جو پہلو مذہب "زر" سے متصادم ہوگا وہاں اللہ تعالیٰ سے معذرت کرلی جائے گی۔"(۵۵)

مصنف یہاں پاکستانیوں کو واضح الفاظ میں یہ کہنا چاہتے ہیں ہم اپنے عیوب کو درست کرنے کی سعی کریں تاکہ ہمارا ملک و معاشرہ بھی ترقی کی راہ پر چلے۔ عطاء الحق قاسمی مغربی ممالک میں پائے جانے والے اسقام کا تذکرہ بھی کھلے الفاظ میں کرتے ہیں اور وہ اپنے ملک کی مفاد پرست پالیسیوں پر طنز کے نشتر بھی چلاتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی کہیں کہیں صالح مبصر کی طرح جو دیکھتے ہیں۔ اس کو ویسے ہی یہاں کہہ دیتے ہیں۔ وہ ہمیں مغرب کی ترقی سے متاثر ہو کر ان کی تعریف نہیں کرتے اور نہ ہی انہیں اپنے وطن سے محبت ان کو اپنے ملک و قوم کی بے جا تعریف کرنے پر اکساتا ہے۔

معاشرتی برائیاں چاہے یورپ میں اتنی ہی سنگین ہوں ایک بات بحر حال واضح ہے۔ انتہائی مادیت پرست معاشرت سے تعلق رکھنے کے باوجود انسانیت کے تقاضوں کو نبھانے کے لیے مغرب میں ملازمین اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں سے تلخ رویہ رکھنے اور طے شدہ معاوضہ سے کم پر ان سے کام لینے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا جبکہ برصغیر کے معاشرے بالخصوص ہندو پاکستان میں ملازمین سے ذلت آمیز رویہ اختیار کرنے میں یہاں کے اشرافیہ کے اقدار میں شامل ہے۔ جو دراصل اپنے سے کم تر لوگوں کو دبانے اور انہیں ذلیل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ کم آبادی کے باوجود محبت کا تصور مغربی معاشرے میں اولین حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے وہاں محنت کرتے ہوئے کسی کے ماتھے پر شکن تک نہیں آتی۔ مغربی معاشرے کا یہ رویہ قابلِ تعریف و تحسین ہے اور قابلِ تقلید بھی۔ اخلاقیات میں رویوں میں یہ رویہ مغربی اقوام کی بہترین صفات میں سے ایک ہے جو ہمیں دکھاتا ہے کہ ہم کس طرح اپنے برے رویوں کو درست کرسکتے ہیں۔

> ”صرف یہی نہیں، چہروں پر مسکراہٹ بھی ہے، ایسے لگتا ہے یہ ڈیوٹی نہیں، تفریح پر آئی ہوئی ہیں۔ چوہدری جاوید اشرف نے بات آگے بڑھائی!
>
> ”آپ ٹھیک کہتے ہیں، میں نے ان دوستوں کی تائید کی لیکن ان کی مستعدی اور تروتازگی کی وجہ یہ ہے کہ یہاں انہیں حقیر سمجھنے والا کوئی نہیں اور دوسرے یہ کہ نہیں اپنے کام کا پورا معاوضہ ملتا ہے ہم اپنے ملازموں کو پورا معاوضہ بھی ادا کرتے اور ان کے ساتھ سلوک بھی اس نوعیت کا ہوتا ہے جو پرانے بادشاہوں کا اپنے غلام سے ہوتا ہے۔“ (۵۶)

عطاء الحق قاسمی جہاں مغربی اقوام کی بعض اخلاقی رویوں کی تعریف کرتا ہے وہیں معاشرے میں بڑھتی ہوئی بے چینی اور مادیت پرستی کی وجہ سے پیدا ہونے والی نفسیاتی خلا کے اوپر بات کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ ایسے معاشرے میں جہاں مرد و زن کو اختلاط کی کھلی اجازت ہے وہاں بہت سے المیے جنم لیتے ہیں اور ایک دوسرے سے سیر راہ جدا ہونے والے لوگ جو معاشرے میں ذہنی طور پر بیمار ہوتے ہیں مگر بظاہر صحت مند نظر آتے ہیں۔ مغربی معاشروں کے بنیادی اخلاقی اقدار میں کمزور کمزور ترقی کی جانب ایک واضح اشارہ کرتے ہیں۔

> "مجھے فولڈن کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ اس نے جس معاشرے میں پرورش پائی۔ وہ اس کے اثرات قبول نہ کر سکی۔ وہ کسی کے ساتھ ڈیٹ پر نہیں جاتی، جس کی وجہ سے اس کی ماں سخت پریشان ہے اور اسے ماہر نفسیات کو بھی دکھا چکی ہے۔ اسے صرف سیاحت اور کتابیں پڑھنے کا شوق ہے، اس نے وضاحت کی وہ لیز بین نہیں اور جنسی طور پر مرد بھی نہیں ہے۔ اسے جب کوئی شخص پسند آیا، وہ اس کے ساتھ شادی کرے گی۔ "تو کیا تمھیں آج تک کوئی پسند نہیں آیا؟ میں نے پوچھا!" آیا تھا، وہ ایک اطالوی نوجوان تھا، کالے بالوں اور کالی آنکھوں والا" اس نے اداس لہجے میں کہا پھر؟
>
> "پھر یہ کہ وہ واپس اٹلی چلا گیا" اس نے ہنستے ہوئے کہا، مگر اسی ہنسی میں جو دکھ تھا، اس کی شدت نے مجھے پگھلا کر رکھ دیا۔"(۵۷)

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات کا مالک ہے۔ اس میں انسان سے وابستہ مادی یا جسمانی اور روحانی دونوں مسائل کے حل کی جانب بھرپور توجہ دی گئی ہے۔ اسی ضابطہ حیات کی پیروی کرنے سے ہر قسم کے مسائل کا خاتمہ ممکن ہے۔ بے لگام مغربی یا سیکولر معاشروں میں جہاں اختلاط کو برا نہیں سمجھا جاتا ہے بلکہ یہ راستہ نہ اختیار کرنے والوں کو برا یا نفسیاتی طور پر مسائل کا شکار سمجھا جاتا ہے۔

انیسویں صدی کو تاریخِ عالم میں کالونیل ازم کے فروغ کے حوالے سے اہم سمجھا جاتا ہے۔ جب دنیا کے چار پانچ طاقت ور ترین ممالک میں اپنی معاشی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اور دیگر خطوں کو قابض رکھ کر

وہاں لوٹ کھسوٹ کے ذریعے اپنے ملک کے معاشی حالات کو سدھارنے کی کوشش کی کالونیکل ازم کے لیے ان ممالک کا سامنا کرنا پڑا۔ ان جنگوں میں کروڑوں انسان لقمۂ اجل بن گئے بعد میں ایشیائی اور افریکی ممالک کے سفاک یورپی ممالک کے تسلط سے آزادی حاصل کرلی۔ برطانیہ میں آسٹریلیا کے عظیم براعظم پر قبضہ کرنے کے بعد اپنے ملک کے مجرموں کو ملک بدر کرکے ان ممالک میں آباد کرنے کی بھرپور کوشش کی اس براعظم کی آبادی موجودہ دور میں بہت کم ہے اور یورپی نوآبادکار اپنے ساتھ لائے گئے مویشیوں اور صنعتی ترقی کے لیے موجود قدیم ورک کی مدد سے اس براعظم میں خوشحال اور ترقی یافتہ بنانے میں کامیاب رہے ہیں۔ تاہم ۱۹۸۰ء کی ستر اور اسی کی دہائی میں جب اس ملک کی حالت قابل تعریف نہ تھی۔ مقامی باشندے آنے والے سیاحوں کو لوٹ کر اپنے اخراجات پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے بدترین رویے کا اظہار کرتے ہیں۔ ان غنڈوں کو اپنی کاروائی کرنے کے لیے علاقے دستیاب نہیں۔ جہاں انسانوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے اور ان لوگوں کو اپنی کاروائی پوری کرنے کے لیے کثیر تعداد میں مواقع دستیاب ہوتے ہیں کیونکہ آسٹریلوی پولیس آبادی کی کمی کی وجہ سے اپنی بھرپور کوشش کے بعد بھی جرائم پر قابو پانے پر ناکام رہتی ہے۔

> ”تاہم مجید وائیں صاحب کا کہنا تھا گھبرانے کی کوئی بات نہیں، کیونکہ ایک تو کسی مقامی غنڈے سے ہمارا کوئی تنازعہ نہیں چل رہا اور دوسری ہماری جیب میں پیسے بھی نہیں ہیں، جب میں نے انہیں بتایا کہ ان شہروں میں زیادہ تر قتل جیب نہ ہی ہونے کی وجہ سے ہوتے ہیں کیونکہ نکتہ نظر یہ ہے کہ آپ لوگ شاپنگ کے لیے بازار جاتے ہیں تو جیبیں نوٹوں سے بھری ہوتی ہیں لیکن جب ایسے مقامات پر آتے ہیں۔ جہاں صرف لٹنے کے لیے آیا جاسکتا ہے تو جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں رکھتے، ان سب باتوں کے باوجود وائیں صاحب خاصے پر امید تھے کہ غنڈے انتہائی اقدام پر نہیں اتریں گے اور محض ٹانگ وغیرہ توڑنے پر اکتفا کریں گے کیونکہ ہماری کلائیوں پر گھڑیاں موجود ہیں جو ہم نے سنگاپور سے مبلغ دوسو روپے کے زیر اثر سے خریدی۔“ (۵۸)

جیسا کہ مغربی اقوام نے وسیع و عریض اجنبی سرزمینوں پر اصولِ زر کے لیے قبضہ کیا تو وہاں کے مقامی باشندوں کو جدید اسلحہ اور مکاری کے ذریعے ختم کر دیا خاص طور پر امریکہ میں ریڈ انڈین اور آسٹریلیا میں (Aboriginal) آبادیوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی مکمل کوشش کی ان وسیع و عریض زمینوں میں چونکہ مادی اور زرعی وسائل کی کمی کی بہتات تھی اس لیے ان کی کھوج اور کشف کے لیے افریقہ اور ایشیا سے غلاموں کی بڑی تعداد بحری جہازوں سے لائی گئی تھی اور مقامی افراد پر ان کی اپنی زمین تنگ کر دی گئی۔ اس سفاک داستان کو تخلیق کرتے ہوئے یورپی نو آبادکاروں کے ذہن میں زرہ برابر رحم نہیں آیا اخلاقیات اور تہذیب کا دعویٰ کرنے والی اس عوام نے اپنی سفاکی کے بدترین نقوش تخلیق کیے۔

> "جو اہل مغرب نے اپنے استعماری عزائم کے لیے کمزور قوموں پر کیے تو آج پوری دنیا پر ان کے تسلط کے پیچھے ان کا ظلم نہیں، ان کی عقل، ان کی بہادری اور سخت جانی بھی کارفرما نظر آتی ہے۔ ظلم بھی صرف وہی کر سکتا جو طاقت کا حامل ہو۔ طاقت کی اخلاقیات میں ظلم کوئی جرم نہیں۔ دنیا میں جو قوم بھی ایک طاقت بن کر ابھرتی ہے۔ وہ اتنی رحمدل نہیں ہوتی جتنی خواہش ہوتی ہے کہ وہ جنگل کا قانون صرف جنگ میں شہروں میں بھی نافذ ہے، انسان معصوم بھیڑ بکریوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھا جاتا ہے اور اس پر اس کا ضمیر اسے ذرا ملامت نہیں کرتا اور اس کے برعکس وہ چیتے وغیرہ کو "درندہ" قرار دیتا ہے کہ وہ موقع ملنے پر "معصوم انسانوں" کو چیر پھاڑ دیتے ہیں۔ سب سے بڑا جرم کمزور ہونا ہے اور سب سے بڑا قانون طاقت کا قانون ہے۔ پتھر کے نیزوں کے مقابلے میں بندوق گولی زیادہ قابلِ احترام اور معتبر ہے کہ وہ ایک وقت میں زیادہ انسانوں کو ہلاک کر سکتی ہے۔ چنانچہ ۱۷۸۸ء میں کیپٹن فلپس نے جب تیر نے والوں کو بندوق سے مار بھگایا تو اس نے کوئی "غیر اخلاقی" کام نہیں کیا۔ طاقت کی اخلاقیات کے مطابق جو حق تھا وہ حقدار کو مل گیا کیپٹن فلپس زندہ باد!۔" (۵۹)

مغربی اقوام کی دیکھا دیکھی ان اقوام نے بھی دنیاوی ترقی کے ان اصولوں کو اپنانے کی کوشش کی۔ جن کی مدد سے ترقی کے راستے کو کم سے کم وقت میں طے کیا گیا تھا یعنی قوانین کی عملداری ۱۹۴۰ء کی دہائی میں آزاد ہونے والا سنگاپور اپنی روایات کا حامل ایک ایسا ملک ہے۔ جس نے مختصر ترین رقبے اور وسائل کی کمیابی کے باوجود قابلِ رشک اقتصادی ترقی کی۔ ترقی کی یہ رفتار اتنی تیز اور ہمہ جہت ہے کہ آزادی کے کچھ عرصے بعد سنگاپور ایسٹس ٹائیگر جیسے ممالک میں شامل ہو چکا ہے جس میں تائیوان اور ہانگ کانگ جیسے ممالک شامل ہیں۔ مصنف کے مطابق تمام اقوام کو چاہیے ان کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو ان کے مابین باہمی افہام و تفہیم اور رواداری برقرار رکھنے کے لیے انجمن کی تخلیق میں جو ہر سال اپنا صدر بدلتی رہتی ہے اور مختلف مذاہب سے ان کا ایک صدر منتخب کیا جاتا ہے۔ اخلاق کے دائروں کو قائم رکھتے ہوئے مشترکہ ترقی کے اصولِ مقصد کو سنگاپور کی معاشی ترقی میں لائف لائین کی حیثیت حاصل ہے۔ مذکورہ پیراگراف میں مصنف باہم شیر و شکر رہنے سے اپنے ملک کی صورتحال پر ہلکے پھلکے انداز میں طنز و مزاح کی کیفیت پیدا کی دراصل بظاہر اس مزاح کے پیچھے ایک بہت بڑا پیغام موجود ہے۔ اخلاقیات اور رواداری کو قائم رکھنے کے لیے سنگاپور کے اس تنظیمی عمل سے سبق حاصل کرنا پاکستان جیسے کثیر القومی و لسانی اور مذہبی تنوع حاصلِ ملک کے لیے ضروری ہے۔

> ”سنگاپور میں ۱۹۴۹ء سے مختلف مذاہب کی ایک مشترکہ انجمن موجود ہے جس کا صدر ہر سال بدلتا رہتا ہے۔ ۱۹۶۶ء میں اس انجمن کا صدر ایک مسلمان اور ۱۹۷۰ء میں ایک سکھ تھا، ظاہر ہے کہ اس انجمن کے قیام کا مقصد تمام مذاہب کے لوگوں کا آپس میں شیر و شکر رکھنا ہے۔ اس کے برعکس ہم لوگوں کو شیر و شکر اس صورت میں زیادہ پسند ہے جب اس جلینیاں بھی پڑی ہوں!۔“ (۶۰)

آزادی کے بعد بدقسمتی سے پاکستان اور ہندوستان دونوں کو ہی ایسی لیڈرشپ کی قلت کا سامنا رہا ہے۔ جو عام مسائل پر قابو پانے میں دونوں ممالک کی نہ صرف مدد کرنے بلکہ صحیح راستہ دکھا کر ترقی کی منزلوں کی جانب گامزن کرے یہی وجہ ہے ستر برس سے زائد عرصے میں ہمارے سے بعد میں آزاد ہونے والے ممالک ترقی کی دوڑ

میں ان دو ممالک سے آگے نکل چکے ہیں۔ سنگاپور بھی انہی ممالک میں سے ایک ہے۔ صفائی، ستھرائی مذہب اسلام میں نصف ایمان تصور کیا جاتا ہے۔ جب مصنف کسی ہندوستانی ہوٹل میں جاتا ہے وہاں سگریٹ کے دھوئیں تو بے ساختہ اپنی ذہنی کم مائیگی اور معاشرت اور اخلاقیات میں یکسانیت کا تذکرہ کرنا ضروری گردانتا ہے۔

"یہاں ہر شخص سگریٹ پی رہا تھا اور اس دھوئیں سے مجھ جیسے سگریٹ نوش دم بھی گھٹتا ہے محسوس ہونے لگا تھا۔ زہر کا علاج زہر سے بھی کیا جاتا ہے چنانچہ ایک سگریٹ میں نے بھی سلگالیا اور بیرے سے ایش ٹرے لانے کو کہا۔ بیرے نے ہنستے ہوئے فرش کی طرف اشارہ کیا اور کہا "صاحب " یہ سارا فرش ایش ٹرے ہے میں نے ایک نظر فرش پر ڈالی تو لگا کہ فرش، سگریٹ کے ٹوٹوں سے بنایا گیا ہے، بجھے ہوئے سگریٹ ادھ بجھے سگریٹ، میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، میں نے سوچا ہم ہندوستانی اور پاکستانی، دنیا کسی بھی ملک میں ہوں، اپنا ایک چھوٹا سا وطن وہاں ضرور آباد کرتے ہیں جہاں اپنی مرضی کی زندگی گزار سکیں! " (۶۱)

عطاء الحق قاسمی اپنے سفر نامے "گوروں کے دیس میں "مغربی معاشرے کی بھرپور تصویر کشی کی ہے بظاہر خوبصورت قانون کا پابند معاشی لحاظ سے خود کفیل اور جدید سہولیات سے مزین انگریزی معاشرہ اندرونی طور پر بے حد کرب و اذیت کا شکار ہے۔ یہ اذیت معاشی لحاظ سے زیادہ اخلاقی و تہذیبی بنیاد پر ہے۔ جس نے کئی نسلوں کو اجاڑ دیا ہے اور مرد و زن اس کے حقیقی مرتبے سے گر اکر پیسہ کمانے والی ایسی مشینوں میں تبدیل کر دیا۔ جن کے نزدیک اخلاقیات سے زیادہ پیسہ اور اصول زر کی اہمیت ہے۔

"معاشی خود کفالت اور مادہ پرستی کے جبر کی وجہ سے خاندان کے افراد کا رشتہ آپس میں کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا جاتا ہے اور بالآخر ٹوٹ جاتا ہے۔ چنانچہ طلاقیں ہوتی ہیں۔ بچے ماں باپ کی محبت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ بہن بھائی کی محبت اور بھائی بہن کی محبت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ بوڑھے والدین اولڈ ہوم میں اپنے بچوں کی شکلیں دیکھنے کو ترس جاتے ہیں، اعلیٰ انسانی قدریں دم توڑنے لگتی ہیں، زندگی کا محور اشیاء کا حصول قرار پاتا ہے اور اس

کی خاطر جوان خوبرو لڑکیاں بد شکل مالدار بوڑھوں کے ساتھ شادی کرتی ہیں ۔۔۔۔۔۔میں اسے تہذیب یافتہ ماننے سے انکار ہوں۔ انسان کو اس کی ذات میں تنہا اور اداس کر دیا گیا ہے۔ مشینوں میں استعمال کے لیے پالا پوسا جاتا ہے۔" (۶۲)

عطاء الحق قاسمی "دلی دوراست" میں کچھ یوں بتاتے ہیں کہ برصغیر کے دو ممالک پاکستان اور ہندوستان ایک ہی وقت میں انگریز کی عملداری سے آزاد ہو کر آزادی کی نعمت سے سرفراز ہوئے۔ دونوں ممالک زبان، رسم ورواج اور بود وباش میں کئی حوالوں سے مشترک اقدار کے حامل ہیں تاہم ایک مسلمان کی حیثیت سے (زاویہ نظر زندگی کے حوالوں سے) بالکل مختلف ہے۔ یہی تفریق ہمارے ہاں صدیوں سے چلی آرہی ہے۔ جس نے ان دو ممالک کو نظریے کی بنیاد پر الگ وطن حاصل کرنے کی جدوجہد پر مجبور کر دیا۔ مصنف نے بھارت کے سفر کے دوران متعدد مرتبہ ان حوالوں سے اپنے وطن کو یاد کرتا ہے۔ جن کی وجہ سے یہ پیارا وطن مسلمانوں کو نصیب ہوا۔ عطاء الحق قاسمی کے ہندوستان کا سفر نامہ "دلی دوراست" میں دو سفر نامے موجود ہیں جو مختلف اوقات موصوف نے اپنی ضرورت کے نظر کیے ہیں۔ ہندوستان کے شہر امرتسر دہلی اور بمبئی لاہور کراچی، ملتان جیسے شہروں میں کئی مماثلتیں نظر آتی ہیں۔ لیکن آبادی کے بے پناہ دباؤ زرعی زمینوں پر مکانوں کے پھیلاؤ شہروں میں گنجائش سے زیادہ آبادی طرزِ رہائش فکر میں یکسانیت جیسے موضوعات عطاء الحق قاسمی کے طرزِ فکر کو ظاہر کرتی ہیں۔ یہ ایک بنیادی حقیقت ہے بطور مسلمان مسلمانوں کا اخلاقی پس منظر اقوام غیر کی نسبت، کہیں زیادہ ثروت مند محسوس ہوتا ہے۔ اخلاقیات کے پیمانے کا مذہب سے گہرا تعلق ہے۔

"اس دوران اس کی نظر میری قمیض کی جیب میں اڑے ہوئے ایگل کے قلم پر پڑی جس کی قیمت زیادہ سے زیادہ تین چار روپے تھی اس نے سوالات کا سلسلہ درمیان میں ہی چھوڑا اور کہا۔"

"مہاراج! یہ قلم بہت خوبصورت ہے!"

میں نے فوراً یہ خوبصورت قلم جیب میں سے نکالا اور اپنی دونوں ہتھیلیوں پر رکھ کر ہاتھ اس کی طرف پھیلا دیئے۔ لالہ جی یہ آپ کی نذر ہے۔

لالہ جی نے کنکھیوں سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر قلم پر اس طرح جھپٹنے جیسے شاہین کبوتر پر جھپٹتا ہے اس کے بعد موصوف نے مجھ سے تمام تر گستاخیوں کی معافی مانگی اور مصافحے کے بعد معانقہ کر کے رخصت ہو گئے!" (۶۳)

عطاء الحق قاسمی اخلاقیات کے مروجہ پیمانوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے مغرب اور مشرق کے معاشروں کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیتے ہیں اور ان میں موجود اختراقات اور اشتراقات بیان کرتے ہوئے ان کا موازنہ اپنی اپنی تہذیب و تمدن سے کرتے ہیں۔ اخلاقی قدروں میں بھی یہی اصول کار فرما ہے کیونکہ معاشرت اور معیشت کو اخلاقیات سے الگ کر کے دیکھا جانا ناممکن ہے۔ اس لیے خالصتاً اخلاق کے پیمانوں کو پیش کرنا عطاء الحق قاسمی کے لیے بھی ناممکن ہے تاہم وہ مزاحیہ انداز میں ایک بڑی بات کہہ جاتے ہیں۔ جو اس پوری تفصیل کے لیے کار آمد ثابت ہوتی ہے ہم مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ اخلاقیات کے پہلو خصوصیات کے ساتھ اپنے لہجے میں ان سفر ناموں میں وارد ہیں۔

اس باب میں عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں موجودہ فکری پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ طنز ادب میں ایک ایسا آلہ ہے جس کی مدد سے کسی خرابی کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ کسی ملغوف رویے کی نقاب کشائی کی جاتی ہے اور اس طنز کا مقصد کسی کی تحقیر نہیں ہوتی بلکہ اس کی مدد سے اصلاح کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ سماجی و تہذیبی خرابیوں کو دور کرنے میں مدد ملے۔ مذکورہ باب میں عطاء الحق قاسمی نے سیاسی، سماجی، اخلاقی اور معاشی سطح پر طنز کی موجودہ مثالوں سے کیا گیا ہے۔ در اصل طنز و تنقید حقیقت نگاری کی ایسی اقسام ہیں جن میں ایک ادیب ایک جراح کی طرح صورتحال کو کھول دیتا ہے تاکہ قاری بیماری کی اصل وجوہات سے آگاہ ہو سکے اور اس کی اصلاح کی کوشش کرے۔ یہ غیر محسوس انداز میں حقیقتوں سے آگاہی کا سفر ہے۔ سماجی عکاسی کے دو زاویے ہیں یعنی مثبت پہلوؤں کی تحسین اور منفی پہلوؤں کی عکاسی۔ یہ کام اکثر ادیب اختیار کرتے ہیں مگر ادیب کا زاویہ نظر طنز اسے

زیادہ خوبصورت اور دلنشین بناتا ہے۔ مغرب اور امریکہ کا سماج مشرقی ممالک بالخصوص پاکستان اور ہندوستان کے لیے بہت زیادہ پر کشش ہیں اور اپنی عمر بھر کی جمع پونجی لگا کر مغرب کے سفر پر کی طرح صورتحال کو کھول دیتا ہے تاکہ قاری بیماری کی اصل وجوہات سے آگاہ ہو سکے اور اس کی اصلاح کی کوشش کرے۔ یہ غیر محسوس انداز میں حقیقتوں سے آگاہی کا سفر ہے۔ سماجی عکاسی کے دو زاویے ہیں یعنی مثبت پہلوؤں کی تحسین اور منفی پہلوؤں کی عکاسی۔ یہ کام اکثر ادیب اختیار کرتے ہیں مگر ادیب کا زاویہ نظر طنز اسے زیادہ خوبصورت اور دلنشین بناتا ہے۔ مغرب اور امریکہ کا سماج مشرقی ممالک بالخصوص پاکستان اور ہندوستان کے لیے بہت زیادہ پر کشش ہیں اور اپنی عمر بھر کی جمع پونجی لگا کر مغرب کے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ وہاں دولت کمانے کی دھن میں انھیں وقت کا پتہ نہیں چلتا اور جب واپس گھر آتے ہیں تو یہاں کا نقشہ ان کے لیے تبدیل ہو چکا ہوتا ہے۔ فحاشی اور عریانی کے مسئلے کو بہت سے ادیبوں نے موضوع بنایا ہے۔ مگر عطاء الحق قاسمی صرف طنز نہیں کرتے بلکہ اس رویے کے عقب میں نظام کی گل سڑ کی بات بھی کرتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں ہمیں ہر صیغے پر ایسا تمہیدی جملہ ضرور ملتا ہے جس کے تناظر میں سیاسی اور سماجی شعور کار فرما ہوتا ہے۔ وہ مغرب اور اس کے باسیوں پر کڑی تنقید کرتے ہیں۔ وہ ہر پہلو پر بات کرتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ ان کے ذہن میں اپنے ملک کی سیاسی اور معاشرتی حالات ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ چاہے وہ لندن کی سیر کر رہے ہوں لیکن وہ ذہنی طور پر لاہور کی سڑکوں پر ہی چلا دیتا ہے اور پھر وہ طرز ہائے زندگی کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اپنے ملک اور یورپ کے قوانین کا جو زاویہ یورپ میں رہنے والے پاکستانیوں کی روزمرہ زندگی اور اقدار کا جائزہ ان کے سفر ناموں میں ملتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی کافی عرصہ سفارتی خدمات انجام دے چکے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ خارجی پالیسی سے آگاہ ہیں۔ وہ جانتے ہیں بھارت اور پاکستان کن حالات سے گزرتے رہتے ہیں اور دونوں ممالک کی طرف سے تعلقات استوار کرنے کی کوششیں جاری رہی ہیں۔ اس پر بھی وہ صحافی ہونے کی حیثیت سے بھی اپنے سفر نامے میں بیان کرتے ہیں۔ وہ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ بھارت نے کبھی بھی پاکستان کو دل سے تسلیم نہیں کیا ہے۔ انھوں نے اپنے سفر نامے میں پاک بھارت کے تعلقات کی تقریباً ساٹھ سالہ تاریخ کا بھی ذکر کیا ہے۔ بھارت میں رہنے والے

مسلمانوں کی پچیس کروڑ کی آبادی کو کتنی اہمیت حاصل ہے اور وہاں کی نوجوان نسل کے ذہن میں ہمارا کیا امیج ہے۔ عطاء الحق قاسمی کے چاروں سفر ناموں میں ہمیں سیاحت کے ساتھ ساتھ سماجی، معاشی، سیاسی اور اخلاقی موضوعات کو ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں۔ تاکہ قاری کے لیے تفکر اور تفریح ایک ساتھ مہیا ہو سکے۔ جب وہ ایسے موضوعات پر آتے ہیں ان میں سفر نامہ نگار کے بجائے کالم نگار کا قلم حرکت میں آتا ہے اس طرح وہ طنز و مزاح کی تیکنیکس استعمال کر کے ملکی اور بین الاقوامی سیاست اور مشرقی و مغربی فکر انگیز پہلوؤں کو ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، اردو نثر میں طنز و مزاح، اکادمی ادبیات ،لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۴۹۲

۲۔ منظور الہیٰ ممتاز، اردو سفر نامے تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے پی۔ ایچ ڈی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۱۳۸

۳۔ اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، اردو نثر میں طنز و مزاح بیت الحکمت، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۲۸

۴۔ محمد خاور نوازش، عطاء الحق قاسمی کی تحریریں سیاسی و سماجی تناظر میں، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۱۳ء، ص ۱۰۸

۵۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۱۰۶

۶۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۱۷۲

۷۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۱۰۹

۸۔ فوزیہ چودھری، شاداب موسموں کی آواز، نستعلیق مطبوعات، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۰۶

۹۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۴۳۸

۱۰۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۳۰۲

۱۱۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اشاعت دوم، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۲۸۱

۱۲۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۳۰۹

۱۳۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۲۸۳

۱۴۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اشاعت دوم ،اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۴۴۳

۱۵۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۴۴۵

۱۶۔ اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، عطاء الحق قاسمی شخصیت و فن، اکادمی ادبیات، اشاعت دوم ،اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۸۱

۱۷۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اشاعت دوم ،اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۶۷۳

۱۸۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۳۰۷

۱۹۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۳۰۷

۲۰۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۳۱۷

۲۱۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۹۰۷

۲۲۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۴۵

۲۳۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۵۷

۲۴۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۶۷۔۵۷

۲۵۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۲۱۳

۲۶۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۲۲۵

۲۷۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۲۴۶

۲۸۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۶۸۰

۲۹۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۶۹۰

۳۰۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۴۶۲

۳۱۔ فوزیہ چودھری، ڈاکٹر، نقد ظرافت اردو طنز و مزاح کے پچاس سال، پولیمر پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۳۷

۳۲۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۴۳۴

۳۳۔ عطاء الحق قاسمی، ص ۴۳۸

۳۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو میں سفر نامہ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، س ن، ص ۶۶۷

۳۵۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۳۰۰

۳۶۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۲۸۶

۳۷۔ محمد خاور نوازش، عطاء الحق قاسمی کی تحریریں سیاسی و سماجی تناظر میں، ناشر شعبہ اردو، بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۱۳ء، ص۱۲۵

۳۸۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۴۷۷

۳۹۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۴۹۱

۴۰۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۳۱۱

۴۱۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۳۲۶

۴۲۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۳۴۴

۴۳۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۴۶۳

۴۴۔ سکندر حیات، عطاء الحق قاسمی، شگفتہ مسافر، ظفر اللہ چوک، سرگودھا، ۲۰۱۲ء، ص۵۵

۴۵۔ ایضاً، ص۵۵

۴۶۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۵۰۳

۴۷۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۳۹۔۴۰

۴۸۔ عطاء الحق قاسمی، ص۵۴

۴۹۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۱۷۳

۵۰۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۱۲۶

۵۱۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۲۰۲

۵۲۔ فرحت وشیر، عطاء الحق قاسمی، ۱۹۹۰ء سے ۲۰۰۴ء تک کے سفر ناموں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے ایم فل اردو پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۴ء۔۲۰۰۳ء، ص۴۶

۵۳۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۲۴۲

۵۴۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۲۵۵

۵۵۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۲۸۲

۵۶۔ عطاءالحق قاسمی، سفر نامے، ص۳۰۹

۵۷۔ عطاءالحق قاسمی، سفر نامے، ص۳۴۱

۵۸۔ عطاءالحق قاسمی، سفر نامے، ص۳۴۸

۵۹۔ عطاءالحق قاسمی، ص۳۵۲

۶۰۔ عطاءالحق قاسمی، سفر نامے، ص۴۰۴

۶۱۔ عطاءالحق قاسمی، سفر نامے، ص۴۱۸

۶۲۔ عطاءالحق قاسمی، سفر نامے، ص۴۶۳

۶۳۔ عطاءالحق قاسمی، سفر نامے، ص۷۰۳

باب سوم :

عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں سماجی طنز کا فنی پہلو

الف: طنز کے مختلف طریقے / تکنیک

طنز عموماً کسی پر چوٹ کرنے اور ان کی خامیوں کو بیان کرنے کو کہتے ہیں۔ طنز میں عموماً ایسے رویے کی توقع کی جاتی ہے جب کوئی شخص دوسرے شخص یا حالاتِ زندگی سے متعلق کسی واقع کے منفی پہلوؤں کو اس طرح اجاگر کرے کہ سب کچھ واضح ہو جائے اور خوبیوں کی بجائے خامیوں پر مجموعہ نظر آئے۔ طنز کے ساتھ عموماً دو الفاظ کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں "طنز و تشنیع" اور طنز و مزاح یا ظرافت ہیں جہاں طنز کے ساتھ تشنیع کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو طنز کی خالصتاً وہ قسم کہلائی جاتی ہے۔ جس میں برائیوں کے بیان کے ساتھ ان کی خامیوں کو بھی نشانہ بنایا جاتا ہے جبکہ طنز و ظرات کی اصلاح میں طنز کی ایسی قسم ہے جس میں طنز اس طرح کیا جاتا ہے جس میں ہنسی اور مزاح کا پہلو نمایاں ہو۔ ایسی صورت میں مصنف کسی معاملے کی ایسی تصویر کشی پر دھیان دیتا ہے۔ جہاں بات کو پہلو دار بیان کرتے ہوئے۔ اس سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مزاح کے دیگر طریقوں میں ایسا طریقہ بھی ہے جس میں بات کو سیدھا بیان کیا جاتا ہے آفاقی سچائی بیان کر کے مزاح پیدا کیا جاتا ہے۔ بعض جگہ جملوں کے اندر الفاظ کے اشتراک یا افتراک کی صورت میں مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے مثلاً اگر کوئی یہ بات کہے کیسے فلاں شخص کے لیے لاہور سے کراچی تک کا سفر بن گیا یہ لفظ اگرچہ صوتی لحاظ سے اردو کے لفظ کے ساتھ یکسانیت رکھتا ہے۔ مگر زبان کے فرق کی وجہ سے اس کی معنویت میں کئی گنا اضافہ ہو رہا ہے۔ مگر بعض جگہ تکرار لفظی کے ساتھ ساتھ ایسے جملے اور ذو معنی الفاظ لکھے جاتے ہیں جن کی مدد سے کئی مطالب کو ایک ساتھ بیان کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔ موجودہ دور میں جب انسانوں نے مادی ترقی کی جانب زیادہ توجہ مرکوز کی ہے اور ذرائع ابلاغ اور آمدورفت میں اس قدر ترقی آچکی ہے۔ کہ پل پل کی خبر سے آگہی حاصل کرنا ناممکن ہو چکا ہے۔ ایسی صورت میں زبانوں کا دوسرے پر اثر ہونا معمول کی بات بن چکی ہے۔ کئی

زبانوں میں یورپی اور انگریزی زبانوں کے اصنافِ ادب متعارف ہو چکے ہیں۔ اسی طرح مزاح کی تکنیک اور طریقہ کار میں بھی یکسانیت کا آنا ایک امر معمول بن چکا ہے۔ آج کے دور میں زبانیں ایک دوسرے کے فریق ہائے مزاح سے ہی استفادہ نہیں کرتیں بلکہ ایک دوسرے کے ذخیرہ الفاظ کو بھی استعمال کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کئی جگہ یہ الفاظ یکسانیت اور افتراک کی وجہ سے مزاح یا معنویت میں اضافہ کا سبب بنتے ہیں۔ زندگی کی سادگی آج کے زمانے میں وہ نہیں رہی جو آج سے پچاس برس قبل تھی۔ الیکٹرانک مشینوں کے استعمال اور پختہ تعمیرات اور زندگی کے تقاضوں کو ہمیشہ کے لئے بدل دیا ہے۔ اس لیے تکنیکوں میں بھی تبدیلیاں آنا ایک معمول بن چکا ہے۔ مزاح پیدا کرنے کے طریقے صرف شاعری میں ہی نہیں بلکہ نثر میں بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ شاعری میں الفاظ کو اپنی ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے جوڑنا اور ان سے مزاح کی کیفیت پیدا کرنا خاصا معمول بن چکا ہے۔ یہی طریقہ بعض اوقات نثر میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر اندازِ بیان کے تاثر میں فرق محسوس کیا جا سکتا ہے۔ چھوٹے جملوں کو لمبا کرنا غیر ضروری طور پر طوالت یا اختصار وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن سے مزاح پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

عطاء الحق قاسمی موجودہ دور کے نہایت ممتاز مزاح نگار میں سے ایک ہیں ایسے مزاح نگار جنھوں نے اردو ادب کے ساتھ اول روز میں سے ہی اپنی وابستگی قائم کر رکھی ہوئی ہے۔ آرٹس کونسل چیرمین اور پی ٹی وی کے سربراہ کی حیثیت سے انھوں نے ادب دوستوں کی سرپرستی کرنے میں اپنا لاثانی کردار ادا کیا۔ وہ مشرقی معاشرے میں پلے بڑھے ہیں وہ ایسے ادیب ہیں جن کا خاندانی پس منظر بھی علم دوستی کا ہے۔ اس وجہ سے وہ عام فہم باتوں میں بھی ایسی بات کہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جو پورے سیاسی و سماجی پس منظر کو بھی واضح کر دیتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی بطور مصنف انتہائی سادہ بیانی سے کام لیتے ہیں۔ ان کا اسلوب عام فہم اور آسانی سے سمجھ میں آجانے والا ہے۔ ان کے اسلوب کی یہ خوبی بھی ہے کہ وہ حد درجہ مشکل بات کو آسان انداز میں بیان کرنے کا شرف رکھتے ہیں اس لیے طنز و مزاح سے کام لیتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر فوزیہ چودھری:

"عطاء الحق قاسمی کے طنز و مزاح کی کئی پرتیں ہیں۔ وہ پہلو دار بات کرتے ہیں جس کی تہہ میں چھپے ہوئے معانی تہہ در تہہ کھلتے جاتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی انسان کا تمسخر نہیں اڑاتے بلکہ ان کا نکتہ نظر بہت ہی ہمدردانہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ انسانوں کے چہرے پر پڑے ہوئے ماسک کو الٹ دیتے ہیں اور ان کے اصلی چہرے بے نقاب کرتے ہیں اس عمل میں تھوڑا بہت تشدد لازمی ہوتا انسانی کمزوریوں پر ان کی بھرپور نگاہ ہوتی ہے اور ان کا ذکر کرتے ہوئے ان کے لہجے میں تلخی نہیں بلکہ چلمی در آتی ہے۔" (۱)

عطاء الحق قاسمی اپنے سفر نامے میں بعض جگہ فلسفیانہ اور مفکرانہ گفتگو کی ہے جو کہ دل سے نکل کر دل پر اثر کرتی ہے اور قاری کو ان کی باتوں کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ سفر نامے میں مختلف مقامات پر جب قاسمی صاحب کے اندر کا فلسفی جاگتا ہے تو بڑی تو بڑی گہری اور روشن باتیں کرتے ہیں۔ چالی چیلن کے قول کے مطابق سچی بات کہہ کر مزاح پیدا کرتے ہیں۔ کسی جگہ موازنہ اور کہیں کہیں تجربہ اور مشاہدہ کام میں لاتے ہیں۔ ٹرین میں سفر کے دوران جب ان کی ملاقات ادھیڑ عمر ہندو لال ویاس سے ہوتی ہے جو ایک خاتون کا بغور مشاہدہ کرنے میں مصروف ہیں تو ٹرین سے اترتے وقت جو جملہ کہتے ہیں وہ دراصل ان کے احساسات کے ساتھ ساتھ مزاح میں سنجیدگی پیدا کرنے کی کوشش یا الفاظِ دیگر یہ کہنا زیادہ اچھا ہے۔ عطاء الحق قاسمی سنجیدہ مزاح پیدا کرنے والوں میں سے ہیں۔

"بالآخر تھوڑی دیر بعد انھوں نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا اور چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ لاکر سرگوشی کے عالم میں گویا ہوئے، کیا بولتی ہے؟ سوچا ایک عرصے سے "دل بدست آور کے حج اکبر است والا مقولہ سننے آئے ہیں آج اس پر عمل بھی کر دکھاؤ سو کیا، "دیوی جی آپ کا پوچھتی تھیں کہ یہ خوبصورت نوجوان کہاں کا ہے؟" یہ سن کر لالہ جی کی باچھیں کھل گئیں۔ اگلے سٹیشن پر مجھے اور لالہ جی دونوں کو اترنا تھا۔۔۔ میں اتر گیا مگر وہ وہیں بیٹھے رہے۔ شاید کوئی کام یاد آگیا ہو، بلاشبہ پاکستان اور ہندوستان دونوں کے عوام کے مسائل ایک ہیں۔" (۲)

عطاء الحق قاسمی اپنے پنجابی پس منظر کی وجہ سے کرداروں کے پنجابی جملوں کو اسی طرح ادا کیا ہے۔ جس طرح سے کرداروں نے اصل میں ادا کیا تھا۔ پنجابی الفاظ کو اردو سفر ناموں میں لکھنے کی کوئی وجہ سامنے نہیں آتی مگر در حقیقت یہی ایک تکنیک ہے۔ وہ اپنا "پنجابی پن" دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس تکنیک سے جملوں میں معنویت میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے یوں بھی پنجابی زبان اردو پر طنز و مزاح کے حوالے سے فوقیت رکھتی ہے۔ جس میں صورتحال کے مطابق ٹھٹھہ پیدا کرنے اور طنز کے نئے طریقوں کو تلاش کرنے میں آسانی رہتی ہے۔

> "ایک بوڑھا فٹ پاتھ پر "بیوں بھار" بیٹھا ہوا تھا۔ یہ یقیناً! سوشل سیکورٹی سوشل سیکورٹی پر تھا اور اپنا ٹائم مکمل کرنے کے لیے رونق بازار دیکھنے گھر سے نکلا ہوا تھا۔
>
> یہ انڈیا میں ایک غریب بھی تھا تو اپنے گاؤں میں بڑا معتبر شخص سمجھا جاتا ہو گا" حسن رضوی نے ایک بہت پتے کی بات کہی" اسے سیانا سمجھ کر لوگ اس سے مشورہ کرتے ہوں گے۔ گھر میں اس کا حکم چلتا ہو گا اس کے پوتے پوتیاں ساتھ کھیلتے ہوں گے۔ یہ کسی درخت کے نیچے حصہ ڈال کر بیٹھ جاتا ہو گا۔ لوگ اس کے گرد دائرہ بنا کر بیٹھ جاتے ہوں گے اس کے ساتھ مذاق بھی کرتے ہوں گے مگر اسے وہاں ایک ایسی خوشی اور برتری میسر ہو گی جس کا کوئی بدل نہیں۔ اب اس کے بیٹے نے اسے یہاں بلایا ہے یہاں یہ اپنی آنکھوں کے سامنے تمام پرانی قدریں پامال ہوتے دیکھتا ہو گا۔ اور "ڈروٹ" جاتا ہو گا۔ بیٹی سے کہنا ہو گا" دھیے سرتے چنی رکھ! اور دھی آگے سے کھڑ کھڑ ہنستی ہوئی اپنے بوائے فرینڈ کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر گھر کی دہلیز سے باہر نکل جاتی ہو گی! آؤ اس سے بات کرتے ہیں۔" (۳)

مصنف نے اپنے سفر ناموں میں بعض تراکیب میں ایسی پھبتیوں کا بھی استعمال کیا ہے جو یورپ میں تحقیق کی وجہ سے ایشیاؤں کے لیے عام اور پاکستانیوں کے لیے بالخصوص استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان میں رنگ برنگی نسلوں والے پاپا کی جیسی بھتیاں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ایسی ہی پھبتیاں وہاں اس لیے معمول بن چکی ہیں آبادی کے تناسب میں تبدیلی بیدار ہو چکی ہے۔

"ٹیوب سٹیشن سے گھر تک واک کرتے ہوئے سامنے سے اچانک ایک اٹھارہ انیس برس کا انگریز نوجوان دوسرے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ہمارے والے فٹ پاتھ پر آگیا اور اس نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے ہمیں رکنے کے لیے کہا

ہم اس کے قریب جا کر رک گئے

"کیا میں تم سے ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟ اس نوجوان کی آنکھوں میں نفرت تھی۔

"پوچھو" میں نے کہا۔

"تمھارا تعلق کس ملک سے ہے؟

"میں پاکستانی ہوں"

"اوہ پاکی" اس نے پاکستانیوں کے لیے رائج تحقیر آمیز لفظ "پاکی" کے ذریعے اپنی کدورت کا اظہار کیا۔ "پھر تو تم یقیناً مسلمان بھی ہو گے۔" (۴)

کوئی بھی قوم اپنے علاقوں میں اجنبی نسلوں کو برداشت نہیں کرتی کیونکہ ایسے افراد معاشرتی اصولوں سے ناواقف ہونے کی بنا پر وہاں کے لوگوں کے لیے مسائل پیدا کرتے ہیں اگرچہ یہ ایک صحت مند علامت سمجھی جاتی ہے۔ ایک معاشرے میں دوسرے معاشروں سے آکر افراد شامل ہوتے ہیں۔ مگر جب یہ افراد اس قدر زیادہ ہو جائیں کہ وہاں کی آبادی کے تناسب تبدیل کرنے کا سبب بن جائیں تو معاشرے میں موجود انتہا پسند عناصر کو اپنے انتہا پسندانہ آلودہ گفتگو سے لوگوں کو گمراہ کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ گزشتہ کم و بیش ستر برسوں سے صنعتی معاشرے کے فروغ پانے کے بعد یورپ اور امریکہ میں آبادی کے تناسب میں کمی واقع ہو چکی ہے اور وہاں شرح پیدائش مسلسل کمی کا شکار ہے اور دوسری جانب جنوبی ایشیا کے ممالک میں آبادی میں اضافہ کی وجہ سے وہ اپنی افرادی قوت کو کم کرنے میں لگے ہیں جس کی وجہ سے دنیا کے ہر خطے میں جنوبی ایشیا کے ممالک کے افراد مل جاتے ہیں۔

ہمارا معاشرہ ایک صدی سے زائد عرصے تک بر طانوی نو آبادی رہا ہے۔ جس کی بنیادی وجہ ہماری صلاحیتوں میں کمی ہر گز نہ تھی بلکہ بر صغیر کے نالائق حکمران نے انگریز سے مرعوبیت بر صغیر کے لوگوں رگ وپے میں اتار دیا۔ مصنف اگر چہ مرعوبیت کا شکار ہیں مگر پھر بھی ایک ایسے معاشرے سے تعلق رکھتا ہے جہاں ان لوگوں سے متاثر ہونا انسانی شان کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں سفر نامہ نگار نے مرعوبیت کی اس حالت کا سخت الفاظ میں مذاق اڑانے کے بجائے جملوں کے ذریعے کیفیت کو بیان کیا ہے۔ جس سے ہماری معاشرتی تصویر نکھر کر سامنے آتی ہے۔

> "ایک ڈالر کے پیچھے تیرا دم نہیں نکل جائے گا۔ مجھے دے ایسے چمکا کے دوں گا کہ تجھے اس میں اپنی شکل نظر آئے۔ اگر چہ راقم العروف نے آئینہ میں اپنی شکل دیکھنے سے حتیٰ المقدور گریز کیا ہے مگر یہ سوچ کر اسے جوتے پالش کرنے کی اجازت دے دی کہ اپنے ہم وطنوں کو یہ بتا سکوں کہ میرے جوتے پالش کرنے کے لیے امریکی قوم کے ایک فرد کو کتنی تگ ودو کرنی پڑتی ہے۔" (۵)

عطاء الحق قاسمی نے لندن کے سفر میں اپنے آپ کو ایک ایسے سیاح کے روپ میں پیش کیا ہے جس نے پہلی دفعہ کسی انگریز کو دیکھا ہو اس لیے ان کو بتانے کا انداز تجسس کے ساتھ مزاح پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ مصنف اس بات کو جانتا ہے کہ ہماری قوم انگریزوں کے انداز و اطوار سے بہت زیادہ متاثر ہے اور ان کی ہر رسم کو پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لہٰذا وہ انگریزوں کے لافانی حسن کے دلدادہ معلوم ہوتے ہیں جو تھوڑے ہی دنوں کے بعد ختم ہو جاتے ہیں اور حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس میں طنز اور ظرافت کا ایسا مرکب ملتا ہے جس سے ان دونوں کو الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔

> "اس وقت کھوئے سے کھوا چھل رہا تھا۔ سکرٹ جین ہاٹ پینٹ اور دوسرے ملبوسات یا غیر ملبوسات سے خود کو آراستہ کیے ہوئے "میمیں" زلفیں کاندھے پر لہرائے اور اونچی ہیل کی جوتی سے ٹک ٹک کی آواز پیدا کرتی ہے۔ تیزی سے باقی سیڑھیاں کی طرف لپک

رہی تھی۔ یہ وہی میمیں ہیں جو یورپ کا سفر اختیار کرنے والے بیشتر مسافروں کے اعصاب پر سوار ہوتی ہیں بلکہ ایک پاکستان دوست کے متعلق تو شنید ہے کہ جب دوران سفر اس کے ہم سفر نے اسے بتایا کہ ہمارا جہاز لندن ائیر پورٹ پر اترنے والا ہے تو اس نے پوری وارفتگی سے کھڑکی میں سے نیچے جھانکا اور بے تابی سے کہا لندن آگیا ہے پھر میمیں کہاں ہیں۔ اس وقت یہی ہمیں اپنے آپ سے بیزار کسی کام کو نمٹانے کے لیے اپنی منزلِ مقصود کی طرف دوڑی جارہی ہیں۔"(۶)

عطاء الحق قاسمی طنز اور مزاح پیدا کرنے کے لیے حوالہ دینے یا کسی مختصر واقعہ کا ذکر کرنے سے گریز نہیں کرتے جو طنز کی شدت میں اضافہ کے ساتھ ساتھ مزاح کی خوبصورتی میں بھی اضافہ کرتا ہے۔ واقعہ کا بیان اس قدر دلنشین اور خوبصورت ہوتا ہے کہ اس سے مذکورہ بات کو نہ صرف الگ پہلو سے دیکھنا ممکن ہو جاتا ہے بلکہ کم فہم اور انسانی نفسیات پر زیادہ دسترس نہ رکھنے والے بھی طنز کو پوری معنویت کے ساتھ سمجھنے میں بھی کامیاب رہتے ہیں۔ بعض اوقات واقعہ کے ساتھ ساتھ اشعار کا حوالہ جہاں معنویت میں اضافہ کرتا ہے وہیں ایک عجیب سابو جھل پن کا بھی سبب بنتا ہے کیونکہ ایک ہی واقعہ کو مسلسل ترجیح دینا سفر نامے میں لذت کو کم کر دیتا ہے۔ مصنف اس واقعہ کو قلمبند تو کر دیتا ہے۔ مگر اس کی وجہ سے طوالت کا باعث بننے سے بچنے کے لیے اہم موضوع اور باتیں چھوڑ دی جاتی ہیں جو تشنگی کا سبب بنتی ہیں۔

عطاء الحق قاسمی واقعاتی مزاح کے ساتھ ساتھ Situation سے بھی مزاح پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کے لیے وہ تگ ودو کرنے کی بجائے اپنی حالت بیان پر توجہ دیتے ہیں۔ وہ کمرے کے منظر کے بجائے اپنی حالت کو بیان کرنے پر زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ یوں لگتا ہے ہ مزاح کرتے ہوئے وہ ایک تیسرے شخص کی طرح اپنی حالت کا بھی مشاہدہ کر رہے ہیں۔ یہ منظر ایک حقیقت کے ساتھ ساتھ جمالیات کا بھی خوبصورت نمونہ تخلیق کرتا ہے۔

"گڈ مارننگ ائیر ہوسٹس ناشتے کا ٹرے لیے کھڑی تھی۔ جہاز کے سبھی مسافر جاگ رہے تھے۔ گلاس کے پھول کی طرح تر و تازہ میر یلین بیٹھی کافی کی چسکیاں لے رہی تھی اور زولا ہاتھ منہ دھونے کے لیے ٹوئلٹ میں تھی۔

"گڈ مارننگ"، میں نے آنکھیں ملتے ہوئے ہونقوں کی طرح باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میر یلین نے ہنستے ہوئے میرے گھٹنوں پر سے کمبل کھینچا اور بے تکلفی سے مجھے بازو سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ "جلدی دانت صاف کر کے آؤ میں ناشتے پر تمھارا انتظار کر رہی ہوں۔" (۷)

دیارِ غیر بس جانے والی پاکستانی اپنے ساتھ کئی کہانیاں دل میں چھپائے لاتے ہیں اور سسکتے سسکتے زندگی کی دوڑ میں غیر ملکیوں کے شانہ بشانہ کام کرنا شروع کرتے ہیں۔ اپنے معاشرے اور ملک سے دور یہ لوگ دوہری اذیت کا شکار ہوتے ہیں۔ ایک تو اپنے وطن سے دوری کا احساس اور دیارِ غیر میں سامنے آئے ناموافق حالات اس طرح کی Situation میں ان کی زندگی تبدیل تو ہو جاتی ہے۔ مگر وہ زندگی کی سختیوں سے سیکھ بھی جاتے ہیں مگر تلخ اوقات کی یہ کیفیت ساری عمر ان کا پیچھا کرتی ہیں اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ماضی کے اسیر رہتے ہیں۔ پیسے کمانے کے بعد جب وہ اپنے وطن کی راہ لیتے ہیں تو انھیں پتہ چلتا ہے کہ جوانی کے جوش میں جب انھوں نے اپنا وطن ترک کیا تھا اور خود کو حالت کے تیز دھارے پر ڈال کر پیسہ کمانے اور اپنی معاشی حالت کو سدھارنے کی کوشش کی تھی۔ اس دوران ان کا اپنا گھر اور خاندان تبدیلیوں کے عظیم دور سے گزر چکا ہے اور محبتوں کے دعویٰ کرنے والے رشتہ داروں کے دن ان کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں مجبوراً وہ دوبارہ پڑوس جالیتے ہیں اور اجنبی لوگوں کے درمیان اجنبی سرزمینوں میں اپنی زندگی کی آخری سانسیں پوری کرتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی نے دکھ اور درد کی اس کیفیت کو ڈرامائی انداز میں اس طرح سے سمویا ہے کہ اس میں ہنسی کی کیفیت کے ساتھ ساتھ آنکھیں نم آگئی تھیں۔ یعنی طنز اور مزاح دونوں کیفیات بیک وقت انسانی ذہن پر اثر کرتی ہیں۔ عموماً ڈرامے کی یہ سوچنے کا موقع ضرور فراہم کرتی ہے۔ جس سے مزاح کا ایک پہلو بھی پیدا ہوتا ہے۔ مگر اس میں معاشرے اور حکومتِ

وقت کے لیے یہ سبق موجود ہے۔ انہیں اپنے لوگوں کی معاشی سدھار کی سوچوں کو تیز کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس کے بغیر انھیں ان لوگوں کی بد دعاؤں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جو اپنی حکمران طبقے کی ظالمانہ اور انسان کش پالیسیوں کی بدولت دیارِ غیر میں پناہ لینے پر مجبور ہوئی۔

"میں نے اپنے ایک عزیز دوست باسط کا پتہ دیا کہ میں اس کی معرفت خط لکھا کروں گا۔ وہ اس کے دفتر سے وصول کر لیا کرے اوپھر میں ہالینڈ چلا آیا۔"

"پھر؟"

پھر کیا! ہوا یوں کہ کچھ مہینے بعد ان دونوں نے آپس میں شادی رچالی!

کہانی میں موجود المیہ عنصر انجام تک پہنچتے پہنچتے بے ساختہ میری ہنسی چھوٹ گئی۔

"تم دانت کیوں نکال رہے ہو" ارشد نے غصے سے پوچھا۔"

"اس لیے کہ میں عرصہ ہوا ایک بات کی تہہ تک پہنچ چکا ہوں"

کس بات کی تہہ تک پہنچتے ہو ذرا پتہ تو چلے؟

"بات یہ ہے کہ جس طرح جوان ہونے پر لڑکوں کا سب سے بڑا مسئلہ نوکری کا ہوتا ہے اسی طرح بالغ ہونے پر لڑکیوں کی سب سے بڑی خواہش گھر بسانے کی ہوتی ہے۔ جسے ہم "عشق" سمجھ بیٹھتے ہیں وہ در اصل قدرے Choice کا مسئلہ ہوتا ہے اور Choice میں بوقت ضرورتِ ردوبدل ہوتی ہے۔" (۸)

صرف یہی ایک مثال نہیں ملتی بلکہ عطاء الحق قاسمی کے سفر نامے میں ہمیں ایسی متعدد مثالیں ملتی ہیں جہاں موضوع کی سنجیدگی کے ساتھ ساتھ عطاء الحق قاسمی شگفتہ اسلوب بھی ساتھ ساتھ پایا جاتا ہے۔ جس سے موضوع کبھی بوجھل محسوس نہیں ہوتا ہے۔

سفر نامہ نگاری کے لیے جس وسعت نگاہ، عمیق مشاہدے اور دقعت نظر اور تخلیقی ویژن کی ضرورت ہوتی ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے ان سے بہت اچھے طریقے سے کام لیا ہے۔ انھوں نے جس وسیع النظری سے منظر کو اپنے وجود کا حصہ بنایا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ اس کے اندر رچ بس گئے ہوں۔ اور وہ اپنے تخلیقی ویژن کے ذریعے ان احساسات واثرات کو تحریر میں لاتے ہیں۔ ایسے کرتے ہوئے وہ شگفتہ پن اور کھلنڈرے پن کو بھی شامل کرتے ہیں۔ ان کی شوخی، شگفتگی اور شرارت کی تہہ میں گداز کی کیفیت موجود ہے جسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ان کی اس شوخی اور گداز کی کیفیت نے ہی اندر کے مزاح نگار کو دریافت کیا ہے۔ عموماً مزاح کے بارے میں ایک رائے قائم کی جاتی ہے۔ مزاح سوز و گداز کی کیفیت سے لینا ہے اور مزاح نگار کے پاس ایک دردمند دل ہوتا ہے جس سے مزاح کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی بنیادی طور پر مزاح نگار لیکن ان کے سفر ناموں میں طنز و مزاح دونوں کے عناصر ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنے سفر ناموں میں طنز و مزاح کا ایسا ادبی زاویہ نکھارا ہے جس میں مزاح بھی پایا جاتا ہے اور طنز انتہائی سبک جو کہ کسی مربوط کا موضوع احاطہ کیے بغیر باتوں باتوں میں قاری کی حِس مزاح کو متحرک کرتے ہوئے اس میں اصلاح پیدا کر دیتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی کے اس اندازے سے قاری مطمئن دکھائی دیتا ہے۔ ان کے اسلوب میں پختگی اور ظرافت نگاری کے بارے میں ڈاکٹر فوزیہ چودھری یوں لکھتی ہیں کہ:

> "عطاء الحق قاسمی یورپی معاشرے کے تہذیبی مظاہرے اور اخلاقی کجرویوں پر لطیف طنز کرتے ہوئے قاری میں جو اصلاحی ردِ عمل پیدا کرنا چاہتے ہیں اس کے لیے انہیں کسی واعظ کا روپ دھارنا نہیں پڑتا۔ بلکہ اس ردعمل کے سوائے ان کی تحریر کے باطن سے پھوٹتے ہیں اور قاری جہاں ان اسلوبِ نگاہ میں ندرت بیان اور نکتہ سنجی سے متاثر ہوتا وہاں ان کی ظرافت نگاری اور شگفتگی بھی اس میں حجت کی کیفت پیدا کرتی ہے۔ عطاء الحق قاسمی کے اسلوب میں رچاؤ اور پختگی تاریخی واقفیت اور کلاسیکی ادب سے شناسائی اور مطالعے کی عادت کی بناء پر آیا ہے۔" (۹)

عطاء الحق قاسمی نے تکنیک میں تجسس اور ڈرامائیٹ کے پہلو کو ہمیشہ مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ بعض جگہ وہ وکسی واقعہ کو یہ تاثر دینے میں کامیاب ہوتے ہیں بعض اوقات ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ لفظوں کے ذریعے طنز اور مزاح کے پہلوؤں کو قائم رکھیں مثلاً Arm Chair یعنی ایسی کُرسی جو بازوؤں کے ہمراہ ہو جب ہم اس کو اردو میں ترجمہ کرتے ہیں تو دستوں والی کُرسی استعمال کی جاتی ہے۔ مگر عطاء الحق قاسمی ذو معنی زبان کے استعمال میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ آرم کرسی کو آرام دہ کہہ کر لکھتے ہیں جس سے ایک طرح کی ذو معنوی کیفیت پیدا ہوتی اور جملے اور لفظ کے تفہیم میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی حالات کے مطابق لفظی بازیگری سے بھی کام لیتے ہیں۔ طنز کے جملہ تراکیب کی طرح لفظی بازیگری سے کام لینا ان کی جامعیت ہے۔ مگر وہ براہِ راست وار کرنے کی بجائے بالواسط کہنے کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ مغرب میں آزادی اظہار کے ساتھ ساتھ اور کئی طرح کی آزادیاں بھی مشرقی لوگوں کے لیے باعث حیرت اور خوشی لیے ہوتی ہے اپنے آپ کو تہذیب یافتہ سمجھنے والے مغربی لوگ دراصل مادہ پرستی اور جسمانی خواہشات کرنے کے دلدادہ ہیں۔ کسی فرد کے دوسرے فرد سے معانقہ اور اچھے کردار کی علامت خیال کیا جاتا ہے۔ لفظ "فحش" کو ذو معنوی انداز میں استعمال کرتا ہے جس سے بات واضح ہو جائے اور پھبتی کی طرح بھی محسوس ہو۔ عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں عام طور پر نظر آتی ہیں:

> "اُس نے کمال بے تکلفی سے کام لیتے ہوئے ایک ہاتھ میری بغل میں دیا اور پھر مجھے قدرے اوپر اٹھا کر بھینچ لیا۔ اس پر میں نے گھبرا کر کنکھیوں سے اپنے ہمسفروں کی طرف دیکھا۔ جو یہ "فحش" منظر بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ میں نے خود کو اپنے پُرخلوص ہم وطن کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی جو نہیں جانتا تھا کہ یورپ میں عورت اور مرد تو پوری آزادی کے ساتھ شاعِ عام پر گلے مل سکتے ہیں۔ مگر یہاں مرد کا مرد کے ساتھ یوں معانقہ کرنا "قابل دست اندازی پولیس" جرم ہے اور ایسے جوڑوں کو "شارع عام پر فحش حرکات" کے الزام میں گرفتار کیا جاسکتا ہے۔" (۱۰)

دیگر مزاح نگاروں کی طرح عطاء الحق قاسمی نے طنز و مزاح کے لیے نئی ترکیب نکالی ہے یعنی شعروں کی صورت میں طنز و مزاح کا نیا پہلو پیدا کرنا۔ بنکاک کو عیاشی کا بین الاقوامی مرکز مانا جاتا ہے۔ اس مرکز میں جاتے وقت عطاء الحق قاسمی نے دو اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ ایک واحد علی شاہ کے لکھے ہوئے مشہور ڈرامے "اندر سبھا" کے کردا کو "راجہ" اور دوسری ترکیب ایک شعر کی صورت میں طنز اور مزاح پیدا کرنے کے لیے مصنف بعض اوقات شعروں کے اندر تبدیلی کر دیتا ہے یا ایک مصرعے کو اسی طرح لکھ دیتا ہے۔ واقعہ کے تناظر میں طنز اور مزاح کا پہلو کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

> "ہماری پہلی منزل بنکاک میں تھی اور بنکاک تک ہمیں تھائی ائیر ویز نے لے جانا تھا۔ فلپس کمپنی نے اس مطالعاتی اور تفریحی دورے کا اہتمام اپنے ۳۴ ڈیلروں کی ضیافت طبع کے لیے کیا تھا۔ جن کا تعلق ملک کے چاروں صوبوں سے تھا اور جنہوں نے خود کو بہترین ڈیلر ثابت کیا تھا۔ میری حیثیت "مبصر" کی تھی۔ گروپ میں جوان بھی تھے، زاہد بھی تھے، رند بھی تھے اور وہ بھی جن کے لیے شاعر نے کہا ہے۔
>
> رند کے رند و، ہاتھ سے جنت نہ گئی
>
> سو میرے آئندہ کئی روز رنگ برنگے انسانوں کی اس "کاک ٹیل" کے ساتھ بسر ہونا تھے، نشہ آنا ہی تھا۔" (۱۱)

ترکیب کے ساتھ ساتھ طنز اور مزاح کے نئے پہلو بھی ان کے سفر ناموں میں آشکار ہوتے ہیں۔ جیسے "ریشم ایسی سکن" یا "جرات رندانہ" جیسے الفاظ قابلِ توجہ اور دلچسپی پیدا کرنے والے ہیں۔

مصنف نے طنز کے پہلو کے اندر دُکھ کے پہلو کو مدِ نظر رکھا ہے۔ ان کا انداز دلوں میں احساس پیدا کرنے والا ہے۔ طنز کے مزاح کے پہلو کے ساتھ ساتھ تکلیف دہ پہلو کو بھی بیان کرتا ہے اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ عطاء الحق قاسمی کا طنز صرف مزاح ہی پیدا نہیں کرتا بلکہ تراکیب کے استعمال میں دُکھ کے پہلو کے ساتھ ساتھ خوشی نظر آتی ہے۔ جو یہ بتانے کی کوشش ہے عطاء الحق قاسمی انسانوں کے بارے میں کس قدر سوچتے ہیں۔

یورپ، امریکہ، آسٹریلیا اور دیگر جنوبِ مشرق ممالک کے سیر میں جہاں تراکیب کی مدد سے دکھ کا پہلو بیان کیا ویسے ہی خوشی کو بھی بیان کیا۔ وہ لفظی بازی گیری کی مدد سے موازنے میں کمال قدرت رکھتے ہیں:

> "بنکاک کو" بین الا قوامی ہیرا منڈی" کی حیثیت حاصل ہے پوری دنیا سے سیاح ایڈر خریدنے آتے ہیں اور وہ واپسی پر اپنے پیاروں میں تقسیم کرتے ہیں۔ عصمت فروشی کو یہاں "سمال انڈسٹری" کی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ گھر گھر میں چھوٹے چھوٹے "یونٹ" قائم ہیں یہاں چھوٹے چھوٹے بچے بھی بطور ایندھن استعمال ہوتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہاں امرد پرستی کا بازار بھی گرم ہے۔ یہ بات میں نے محاورتاً نہیں کہی بلکہ اس مقصد کے لیے واقعی خصوصی طور پر ایک بازار موجود ہے۔" (۱۲)

بعض اوقات مصنف عطاء الحق قاسمی بیانیہ انداز اختیار کرتے ہوئے اچانک ایک ایسا جملہ لکھتے ہیں۔ جس سے ماحول کو سمجھنے کا ایک نیا پہلو سامنے آتا ہے۔ مثلاً سنگاپور میں قیام کے دوران مصنف نے یہاں کے اُصول اور ضوابط کے متعلق صراحت سے بیان کیا ہے۔ مگر آخر میں ایک ایسا جملہ لکھ دیا ہے جس سے پورے پس منظر کو سمجھنے اور ان پر طنز کرنے کا ایک بہترین موقع ملتا ہے۔ در اصل عطاء الحق قاسمی جملوں کی ایسی صورتحال تخلیق کرتے ہیں جہاں کسی ملک کے اصول کی تعریف نہ کرنی ہو۔ اس کے لیے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے لوگوں کو چونکا دیتے ہیں اور افسوس اس بات پہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ اس کو بہتر اور اچھا سمجھتے ہیں:

> "مگر سچی بات یہ ہے کہ وہ اس مختصر سے ملک (رقبہ ۲۲۱ مربع) میل اور آبادی لاہور کے گلبرگ جتنی) کے اصول ہمیں کچھ زیادہ پسند نہیں آئے۔ سگریٹ نوشی پر مکمل پابندی صرف بغیر چھت والے مقامات پر پینے کی آزادی ہے۔ لمبے بالوں والے سیاحوں کا شہر میں داخلہ بند، جس نے داخل ہونا ہے۔ انسانوں کی طرح حجامت بنوا کر داخل ہو، سڑکوں پر تھوکنے اور کاغذ تک پھینکنے کی سخت ممانعت، خلاف ورزی پر بھاری جرمانے کے علاوہ کوڑے بھی مارے جاتے ہیں۔ مختلف قوموں کی غلامی کے بعد ۱۹۶۵ء میں سنگاپور کو مکمل آزادی نصیب ہوئی لیکن افسوس اب یہ ملک اصول کا "غلام" ہے!۔" (۱۳)

مذکورہ بالا آخری جملے میں بالا کا طنز اور تلخی ملتی ہے جو در حقیقت ہمارے ملک میں قانون کی حکمرانی کا تصور نہ ہونے کے برابر ہے۔ سنگاپور ہمارے بعد آزاد ہونے والے ان ممالک میں سے ہے جو معاشی لحاظ سے بھی ہم سے کوسوں دور تھے مگر اب ہم سے کئی گناہ زیادہ ترقی یافتہ ممالک میں شمار ہوتے ہیں۔ طنز کرتے ہوئے عطاء الحق قاسمی مندرجہ بالا پیراگراف کے آخری فقرے کی مانند اپنے بیان تشنہ حالت میں چھوڑ کر قاری کو غور و فکر کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ مگر بعض جگہ وہ طنز کرنے اور مسئلے اور تکلیف کے بیان کرنے کے بعد اس کی وضاحت دینے سے بھی نہیں کتراتے۔ مثلاً ایک جگہ وہ اس بات کا تذکرہ بھی کر دیتے ہیں۔ ہم نے حلال و حرام کے پیمانوں کو اپنی خواہش کے طابع کر دیا ہے اور اسلام کے مطابق عمل کرنے سے عموماً پیچھا چھڑانے کی کوشش کی ہے تو بایں ہمہ اس بات کا تذکرہ بھی کیا ہے یہ سب اس بڑے کارنامے کی وجہ سے ہے جس کی وجہ سے مسلمان صدیوں سے زوال کا شکار بھی ہے۔

> ”امام اعظم ابو حنیفہؒ سے کوفے کے ایک شخص نے مسئلہ پوچھا کہ مچھر مارنا جائز ہے؟ امام اعظم نے فرمایا ”کم بختو تم کے امام حسینؓ کو چھوڑا نہیں اور مچھر کے بارے فتویٰ پوچھنے آگئے ہو“۔ ہماری قوم کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے ایشوز کو نان ایشو اور نان ایشوز کو ایشوز میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہ سلسلہ ملوکیت کے دور سے جاری ہے اور خدا جانے کب تک جاری رہے گا؟۔“ (۱۴)

مصنف نے بعض اوقات افعال اور کردار کی بنا پر تشبیہات اور استعارات کا استعمال کیا ہے جیسا کہ لباس اور پیشے کی بنا پر حیدر آباد کی ایک خاتون کو کشور ناہید سے تشبیہہ دی ہے۔ تشبیہہ دینے کا مقصد طنز کے ساتھ ساتھ جملے کی معنویت اور وسعت میں اضافہ بھی ہے۔ مذکورہ خاتون بقول مصنف کو گندر پال کے مطابق حیدر آباد کی ”کشور ناہید“ ہیں یوں اس ایک جملے میں ایک پوری کیفیت چھپی ہوئی ہے۔ جو جاننے والا ہی ملاحظہ کر سکتا ہے۔

"ایک چالیس بیالیس سالہ خاتون حسن کی ساڑھی کا پلو بار بار فراز سے نشیب کی طرف ڈھلک ڈھلک جاتا تھا اور جو کبھی یقیناً بہت خوبصورت رہی ہوں گی۔ کیونکہ آثار یہی بتا رہئ تھے۔ کھانے کے دوران جوگندر پال نے بتلایا کہ یہ حیدر آباد کی تہذیبی اور ادبی زندگی کی جان ہیں بس تم یہی سمجھ لو کہ یہاں کی کشور ناہید ہیں۔ جوگندر پال کے اس تعارف کے بعد شوق ملاقات فزوں ہوا۔ مگر بعد میں حیدرآباد کی بے پناہ مہمان نواز یسوں نے تفصیلی ملاقات کی حسرت پوری نہ ہونے دی۔" (۱۵)

موقع کی مناسبت سے مصنف نے شعر بھی استعمال کیے ہیں کیونکہ ہندوستان کے سفر کے دوران سید ضمیر جعفری ان کے ہمراہ تھے اس لیے بعض جگہ طنزیہ انداز میں شعر طنز کے دائرے کو بڑھانے اور اثر کو دوچند کرنے کے لیے استعمال کیے ہیں۔

"جو ٹیکسی ڈرائیور ہمارے حصے میں آیا وہ موناسکھ تھا، موناسکھ وہ ہوتا ہے جس کی داڑھی نہ ہو(جس طرح ہم سب مونے مسلمان ہیں) اس سردار کو پاکستانی فلم مولا جٹ کے سارے ڈائیلاگ زبانی یاد تھے۔ بمبئی کی سڑکوں پر سرپٹ گاڑی دوڑاتے ہوئے یہ ڈائیلاگ شروع کیے ہم نے تھوڑی بڑی مشکل سے شخص مذکور کو اس" دھمکی آمیز گفتگو" سے روکا۔۔۔۔ میں نے عرض کیا؟ کسی شریفانہ سے ہوٹل میں لے جاؤ"؟

یہ سنتے ہی اس نے قہقہہ لگایا اور بولا"۔۔۔۔۔اب ضمیر صاحب اسے یہ شعر تو نہیں سنا سکتے تھے

خلاف شرع تو یوں شیخ بھوکتے بھی نہیں

مگر اندھیرے اجالے ہیں چوکتے بھی نہیں۔" (۱۶)

طنز کی ترکیبوں میں ہم آواز الفاظ کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے بعض جگہ ہم آواز الفاظ کو ایک جملے میں لاکر مصنف نے نئے معنوی پیرائے میں استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ جیسے "حسنِ زن" سے حسنِ ظن بہتر ہے یا

بعض اوقات الفاظ کے استعمال سے مزاح پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے "مہاسبھائی" اور حسن سنگھی جیسی تنظیمیں ہندوستان کی نام نہاد جمہوریت پر ایک بد نما داغ ہیں۔ تو ایسی صورت میں مصنف نے اس ذہنیت کے پس منظر میں گائے کے ذبیحہ پر پابندی اور ہندوستان کی تقسیم جیسے معاملات پر بولنا اس کے خرمن میں آگ لگانے کے مترادف ہے۔

"جو سکھ ڈرائیور ہمارے حصے آیا وہ خالصانی سکھ تھا، سکھوں کے قتل عام کا سانحہ تازہ تازہ تھا۔ چنانچہ زخم بھی تازہ تھے ہمارے ان دوستوں کو اب ہماری بات سمجھ آتی ہے۔۔۔۔

"واھگرو کی پاسے وہ ٹھیک ٹھاک ہیں اور حسبِ معمول مشاعرے لوٹ رہے ہیں۔"

"وہ بھی خیری سے ہیں"

اپنے دلیب سنگھ ہوری؟

"وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہیں اور مزاح نگاری میں مشغول۔۔۔۔۔

"اگر یہ سب خیریت سے ہیں تو پھر ہندو کن سکھوں کو مارتے ہیں؟"(۱۷)

ب: طنز کا لسانی پہلو

عطاء الحق قاسمی کی تحریر کی خصوصیات کو دیکھتے ہوئے چند چیزیں ذہن میں رکھنی پڑتی ہیں اول تو یہ کہ وہ نہایت عام فہم زبان استعمال کرتے ہیں اور لگی لپٹی رکھے بغیر اپنی بات پوری وضاحت سے کرتے ہیں۔ طنز اور ظرافت میں اضافہ کے لیے وہ پنجابی اور انگریزی الفاظ کا ٹچ دینے سے گریز نہیں کرتے مگر انگریزی الفاظ کے استعمال کا مقصد انگریزی زبان سے مرعوب نہیں بلکہ وہ تفہیم کے پہلو کو زیادہ مناسب سمجھتے ہیں کیونکہ چند الفاظ کا اردو ترجمہ لسانی تفہیم کا وہ کام نہیں کرنے جو انگریزی الفاظ کے تعین ہی استعمال میں مضمر ہے۔ عطاء الحق قاسمی یہ بات بخوبی سمجھتے ہیں پنجابی زبان طنز اور ظرافت کے لحاظ سے اردو زبان پر کئی گناہ سبقت رکھتی ہے۔

"یہ جو وقت کی پابندی ہے۔ میر کا لطف غارت کرتی ہے۔ اس میں اطہر حلیم کا کوئی قصور نہیں۔ وہ تو ایک سچے کھرے پاکستانی ہیں۔ ان کے بس میں ہوتا تو وہاں دس بجے پہنچتے، گیارہ بجے پہنچتے، یا دوسری پارٹی کو اطلاع کیے بغیر وہ پروگرام ہی کینسل کر دیتے لیکن اصل پھڈا تو ان اہلِ مغرب کا ہے۔ یہ لوگ نو بجے کا مطلب ٹھیک نو بجے لیتے ہیں اور اس کے بعد ایک ایک منٹ انہیں ایک ایک گھنٹے کا لگتا ہے۔" (۱۸)

عطاء الحق قاسمی اگرچہ حد درجہ سادہ زبان استعمال کرتے ہیں مگر وہ بعض جگہ تشنگی کی ایک کیفیت پیدا کرتے ہیں یعنی معلومات کو اس طرح فراہم کرتے ہیں۔ انسانی مزید پڑھنے کی جانب مائل ہو جاتا اور رُکے بغیر پڑھتا رہے۔ یہ طریقہ اگرچہ کئی ادیبوں کے ہاں موجود ہے۔ مگر یہ بات ہم اس طرح سے کہہ سکتے ہیں کہ مصنف قاری کی نفسیات سے بخوبی آگاہ ہے اور اس کے متعلق معلومات کی مکمل فراہمی یا ادھورا چھوڑ دینے کی فن سے بھی مکمل معلومات رکھتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی بعض اوقات سادہ بیانیہ میں ایسے نکات نکالتے ہیں جس کی طرف ہمارا دھیان بھی نہیں جاتا ظریفانہ انداز بیان عام طور پر ممکن نہیں ہوتا مگر مصنف اپنی ظریفانہ انداز کے مطابق اس بات کو نمایاں کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ ادب میں ایک طریقہ جو نفسیاتی طریقہ کسی بات کو نمایاں کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ وہ یہ کسی بات کو اتنا زیادہ عام فہم کر کے وہ قاری کی نظر میں اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ بہت زیادہ عمومیت بالعموم قاری کے لیے چونکا دینے کا سبب بنتی ہیں۔

اگر ہم کسی سنجیدہ سفر نامہ نویس کی انداز تحریر کو دیکھیں گے تو اس میں عموماً اپنے ملک کے کھلے اصولوں اور واشگاف انداز میں کیا ہو گا مگر عطاء الحق قاسمی کا طنز ان سنجیدہ نثر نگاروں کی نسبت کہیں زیادہ موثر ہے جنھوں نے خطیبانہ انداز اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اچٹتی ہوئی نظر سے جس معاملے کو دیکھتے ہیں در حقیقت وہی ان کا اہم نکتہ ہوتا ہے۔ یہ پیراگراف اس طرح کی سادہ بیانی کی اعلیٰ مثال قرار دی جاسکتی ہے۔

"یہ مشکل مرحلہ میزبانوں کی طرف سے موصول ہونے والا وہ چھپا ہوا "ہدایت نامہ" تھا جو روانگی سے صرف ایک دن قبل موصول ہوا۔ اگر مجھے پہلے سے علم ہوتا کہ کمپنی والے اتنی کڑی شرائط عائد کریں گے تو میں اپنا "استعفیٰ" بہ حسرت ویاش میں پیش کر دیتا۔ مثلاً اس ہدایت نامے مسافروں کو ہدایت کی گئی تھی۔

آسٹریلیا اور سنگاپور میں قیام کے دوران "ناپسندیدہ" حرکات سے پرہیز کریں نیز سڑکوں پر گندگی نہ پھیلائیں۔۔۔۔ غیر ملکیوں سے اچھے اخلاق سے پیش آتیں۔" (۱۹)

عطاء الحق قاسمی کی زبان میں سلاست کے ساتھ ساتھ عوامیت کا بھی ایک پہلو نظر آتا ہے۔ سفر نامے کا مطالعہ کرتے ہوئے ہوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں ایک ادیب کے ساتھ ساتھ لاہور کے میلوں ٹھیلوں میں پھرتے ہوئے ایک مزدور یا قاری کا دل ہے۔ وہ ادبی اصطلاحوں کے لیے عوامی زبان استعمال کرنے سے نہیں کتراتے اور بطور طنز جہاں انھیں کوئی ایسا ثقیل لفظ یا اصطلاح استعمال کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو طنزاً اسے قوسین میں درج کر کے اپنی کم فہمی کا ثبوت دینے کی کوشش کرتے ہیں اپنے دوستوں کے ساتھ گفتگو میں جو عام فہم اور نارمل انسانی رویہ عطاء الحق قاسمی اختیار کرتے ہیں۔ وہ قاری کے لیے دلچسپی کے ساتھ ساتھ اس اطمینان کا بھی باعث بنتا ہے کہ عطاء الحق قاسمی اپنی زبان دانی کی مہارت کے ساتھ ساتھ ایک عام انسان کی طرح سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے کی بھی صلاحیت رکھتے ہیں۔

"میں نے تو اسے مشورہ دیا ہے کہ یہ لبوب کبیر استعمال کرے مگر یہ مانتا ہی نہیں، کہتا تھا قاسمی صاحب سے مشورہ کرنا ہے چنانچہ آپ کے پاس لایا ہوں"

اجمل نے کہا خلیل صاحب یہ رکاوٹ تو ہم ایسے لوگوں کو پیش آتی ہے۔ جو فطری شاعر نہیں ہیں۔ آپ کے متعلق مجھے یقین ہے کہ جس طرح بعض لوگ منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوتے ہیں اسی طرح آپ منہ میں شاعری کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے تھے۔"

"کڑچھا سر، کڑچھا!" اجمل نے مداخلت کی۔" (۲۰)

ڈرامائی انداز عطاء الحق قاسمی کے طنز نگارش کی نمایاں پہچان ہے جس سے قاری میں تجسس اور دلچسپی کی ایک کیفیت نمودار ہوتی ہے۔ عطاء الحق قاسمی کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر دفعہ تجسس پیدا کرنے کے لیے نئے طریقوں کو استعمال کرتے ہیں تو کسی جگہ پورا واقعہ بیان کرنے کے بعد بھی کچھ علامات خفیہ رکھ کر قاری کے جذبہ تجسس کو ہوا دیتے ہیں۔ وہ علاقوں کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ لوگوں کے رویوں کو بھی زبان دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اثرات دوچند ہو جاتے ہیں لوگوں کے رویوں کو ان کے اندازِ گفتگو سے جانچنا اور پھر انھیں اپنے ملک کے حالات سے موازنہ ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں پنجابی الفاظ اور عام الفاظ کو تحسین درج کر کے قاری کو توجہ مبذول کرانے ان کے طرزِ نگارش کی نمایاں خصوصیت ہے۔

> "ہم نے ریستوران میں کافی کے دو تین "دور" چلاتے تھے اور گزرے دنوں کی باتیں کرتے رہے تھے چنانچہ وقت گزرنے کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ باہر نکلے تو بازار اجڑ چکا تھا۔ فٹ پاتھ خالی ہو چکے اور سڑک پر اکا دکا بر کا لوگ نظر آرہے تھے۔ ایک لے خواہ حالتِ بے خودی میں عشقیہ گیت گاتا، پتلون کے بٹن کھولے فٹ پاتھ پر "دھواں دھار" حرکت کرتا چلا جارہا تھا۔ غالباً یہ کوئی ناکام عاشق تھا اور "آبِ رواں" سے اپنی داستانِ عشق رقم کرایا تھا۔"(۲۱)

عطاء الحق قاسمی نے اپنے سفر ناموں میں لسانی پہلو کے ایک نئے انداز کو متعارف کروایا ہے وہ باقاعدہ ایک نظم یا اشعار کے ایک بڑے مجموعے کے ذریعے خاص قسم کی حالت کو تخلیق کرنا ہے۔ عطاء الحق قاسمی ایسا اس وقت کرتے ہیں جب ایک بڑی فلسفیانہ نکتے پر بات کرنا مقصود ہو۔ عموماً یہ بات چھوٹی مگر اثر انگیز اور دیرپا حیثیت کی حامل ہوتی ہے۔ ایک نظم بھانڈے "قلعی کرالو" کے اندراج کے بعد جب مصنف اس نکتے کے سلجھاؤ کی بات کرتے ہیں تو انہیں سنہری حروف میں لکھا جاسکتا ہے۔ یہ ان کی زبان دانی اور زبان و بیان میں انسانی نفسیات کے کردار کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی جانب ایک زبردست اور واضح اشارہ ہے۔

"میں میلے برتنوں والی گلی میں رہتا ہوں

دن میں کئی مرتب میرے کانوں کو یہ صدا سنائی دیتی ہے۔

بھانڈے قلعی کرالو

بھانڈے قلعی کرنے والے ان گلیوں میں ہجرت کر گئے ہیں

اور اپنے میلے برتن یہاں چھوڑے گئے ہیں

آواز برتنوں کا پیچھا کرتی رہتی ہے!

بھانڈے قلعی کرالو۔"(۲۲)

مجھے لگتا ہے بھانڈے قلعی کرنے والے خود بھی ملک سے ہجرت کر گئے ہیں۔ صرف اپنی آوازیں چھوڑ گئے۔ یہ نظم پسماندہ اقوام کے حوالے سے لکھی ہے جس کی تشریح "قیوم صاحب" اس انداز میں کرتے ہیں۔ جو رہنما قوم کی اصطلاح کرنے کے دعوے تو کرتے ہیں مگر عملاً وہ کچھ نہیں کرتے۔ اس طرح ہماری قوم میں موجود ٹیلنٹ ضائع چلا جاتا ہے اور اعلیٰ وہ ہیں جو ہماری قوم کے ہنر کو تسلیم نہیں کرتیں۔

ج: طنز کا مجموعی اسلوب

اسلوب انگریزی زبان کا لفظ Style سے ماخوذ ہے۔ اسلوب کے معنی ایسے انداز کے ہیں جس سے کسی شخص یا ادیب کی پہچان ممکن ہو سکے در حقیقت ان تمام فنون اور خصوصیات کا مجموعہ کہلاتا ہے جو کم یا زیادہ مقدار میں ہوتے ہوئے کسی شخص کی انفرادیت کو واضح کرتی ہیں۔ اسلوب کی اصطلاح صرف ادب کے لیے ہی استعمال نہیں بلکہ معاشرت اور زندگی کے لیے بھی استعمال ہو سکتی ہے۔ جس سے زندگی کے تمام پہلوؤں کا بحیثیت مجموعی جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ انسانی معاشرہ، ماحول، بود و باش اور زبان کے لحاظ سے الگ ہو سکتا ہے مگر تخلیق کے

بنیادی طریقہ کار سے انکار ممکن نہیں یہی مماثلت انسانوں کو بعض پہلوؤں سے یکسانیت سے ہم آہنگ کرتی ہے تو بعض جگہ اختلافات اور تفرقات بھی سامنے آتے ہیں۔ جب ہم کسی ادیب کے اسلوب کی بات کرتے ہیں تو درحقیقت اس میں فکر، ذخیرہ الفاظ، معاشرت اور زمانوی لحاظ سے اثرات تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دراصل الفاظ و علامات ہوتی ہیں جن کی مدد سے کسی ادیب کی ذہنی و تربیت گھریلو ماحول علم کی صحیح صحیح نشاندہی کرنا آسان ہوتا ہے۔ فن اور اسلوب میں فرق یہ ہے کہ فن میں فنی نوعیت کی بنیاد مختصر ہوتی ہے۔ جبکہ اسلوب جامع اور مکمل حیثیت رکھتا ہے۔ اسلوب دراصل فن کے حوالے سے کیفیت بھی بتاتا ہے یا بتا سکتا ہے کہ فکر و فن کے مرحلے کے دوران ادیب کو کن چیزوں نے زیادہ متاثر کیا ہے۔ یوں صرف فنی مباحث خاص قسم کی تشنگی رکھتے ہیں جبکہ اسلوب فن کی اس کمی کو پورا کر دیتا ہے۔

اسلوب کو کسی بھی سفر نامے کی تشکیل میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ سفر نامے میں کوئی بھی موضوع ہو مذہبی، اخلاقی یا پھر تعلیمی اس کی ترتیب و تنظیم میں فنی نزاکتوں کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔ اگر سفر نامے میں زبان و بیان کا استعمال ٹھیک سے نہ کیا گیا ہو تو اس فنی خوبیوں کے باوجود موضوع سفر نامے کی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتا۔ سفر نامے میں مشاہدے کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس میں اظہار کے لیے الفاظ کا درست نگر ہونا پڑتا ہے۔

سفر نامہ نگار کے مشاہدات و تجربات کو ادبی صنف میں تبدیل کر دینے میں الفاظ بنیادی طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔

> "Style has been defined to be the peculiar manner in which exam express his conception through the medium of language. It is a picture of the ideas which in his mind, and of the manner in which they arise."(۲۳)

ترجمہ: اسلوب کی یہ تعریف وضع کی گئی ہے یہ ایک ایسا طریقہ کار ہے۔ جس میں آدمی زبان کے میڈیم کو استعمال کرتے ہوئے اپنے خیال کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ اس کے خیالات کی ایک تصویر ہے اور اس ترتیب کی جو اس کے ذہن میں آتے ہیں۔

اسلوب میں دو چیزوں کا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ افکار و خیالات اور الفاظ کو جبکہ ترجیح خیال کو دی جاتی ہے۔ کیونکہ سفر نامہ نگار خیال کو اپنی ذات تک ہی محدود رکھے گا تو اس سے سفر نامہ بے معنی ہو جاتا ہے اور اظہار کرنے کے لیے زبان کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس دور میں علم و فنون میں وسعت آجانے کی وجہ سے زبان میں بھی بنیادی تبدیلیاں آئی ہیں جس میں اسلوب کو پرکھے جانے کے معیار بھی تبدیل ہو گئے ہیں۔ وہی اسلوب معیاری ہوتا ہے جو دلنشیں ہو، سادہ اور آسان ہو۔

والٹر پٹر اس بارے میں کچھ یوں اظہار کرتے ہیں:

"بے شمار لفظوں کے درمیان ایک کے خیال کو ظاہر کرنے کے لیے ایک ہی لفظ ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں سے بھی کام چل سکتا ہے۔ مگر موزوں بیان جو بے مثل لفظ، تلفظ فقرہ، اقتباس، مضمون یا نغمہ ہے اس کی تنظیم و ترتیب کا نام اسلوب ہے۔" (۲۴)

ایک مزاح نگار شاعر اور ڈراما نگار ہونے کی وجہ سے عطاء الحق قاسمی سفر نامہ نویسی ہیں۔ نئی حیثیت رکھتے ہیں اگرچہ انھوں نے یہ سفر نامے مذکورہ اسفار پر تحریر کیے ہیں۔ مگر مجموعی سفر نامہ نگاروں کی طرح ان کا اسلوب ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے سفر ناموں میں ڈرامائی، افسانوی اور داستانوی عناصر کے ساتھ ساتھ مزاح نگار نکات بھی مکمل وضاحت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ ان کے اسلوب کو دیکھتے ہوئے ہمیں چند چیزیں جو جدید دور کے سفر نامہ نگاروں کے ہاں مفقود نظر آتی ہیں۔ ان کے ہاں پوری وضاحت کے ساتھ موجود ہیں۔ اول الذکر یہ کہ عطاء الحق قاسمی کا بیانیہ اسلوب اور مکالماتی انداز ہونے کے ساتھ ساتھ ڈرامائی تاثر بھی رکھتا ہے جس میں چونکا دینے والے انجام، جیتے جاگتے کردار اور جاندار مکالمے ہمیں ان کے سفر ناموں کے ابواب میں ملتے ہیں۔ مثلاً "شوق آوارگی" میں ایک باب "ایک گلی سڑی لاش" پیش کی گئی ہے جس میں ڈرامائی کیفیت کے ساتھ ساتھ تجسس

بھی پایا جاتا ہے۔ جیتے جاگتے کردار متعارف کروائے گئے ہیں۔ اس میں کہانی کے تمام لوازمات پائے جاتے ہیں اور مصنف کا انداز بیاں اس کی ادبیت میں اضافہ کر دیتا۔ ایسی بہت سی مثالیں جو ان کے تمام سفر ناموں میں بکھری پڑی ہیں۔

"اتنے میں دروازہ کھلا اور ہاٹ پینٹ میں ملبوس ایک دوشیزہ گھبرائی سی اندر داخل ہوئی۔ اسی عالم میں ادھر اُدھر دیکھنے کے بعد اس کی نظریں مجھ پر ٹھہر گئیں اور پھر وہ میرے قریب آن کر کھڑی ہو گئی۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟" اس خوبصورت ڈچ دوشیزہ نے نہایت ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں گھبراتے ہوئے انداز میں مجھ سے پوچھا۔

"مائی پلیشر" میں نے شائستگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی برابر والی کرسی کھسکائے ہوئے جواب دیا!

"ابھی ابھی ایک شخص یہاں آئے گا، تم اس سے کہنا کہ الریک شناپ ناگن میری دوست ہے۔" اس نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے التجا کی۔" (۲۵)

بعض اوقات عطاء الحق قاسمی بیانیہ انداز کا ایک نیا طریقہ متعارف کروایا ہے وہ پنجابی الفاظ اور مقامی اصطلاحات کو اس طرح سامنے لاتے ہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایسی داستان سنا رہے ہیں جس میں ان کے سامعین میں ہر قسم کے سننے والے شامل ہیں اس لیے وہ جان بوجھ کر ان الفاظ کا استعمال جس میں معنویت کے ساتھ ساتھ اپنائیت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ وہ ایک ناصح کی مانند سمجھانے سے گریز کرتے ہیں اور نہ ہی اپنے آپکو عالم فاضل شخص کو متعارف کرواتے ہیں مگر صرف انہی اصطلاحات اور سادہ اسلوب کی بنا پر اپنے قاری کو آسانی سے گرویدہ کر لیتے ہیں ان کا داستانی انداز سادہ، مختصر اور چھوٹے جملوں پر مشتمل ہوتا ہے جو انتہائی عام فہم نہیں بلکہ اگر شعری زبان میں ان کے طرزِ نگارش کو نام دیا جائے تو سہلِ ممتنع کہا جا سکتا ہے۔ جملے آسان اور ابلاغ مگر فلسفیانہ کیفیت گہری اور وہ بعض اوقات ایسے جملے استعمال کرتے ہیں جو ان کی شخصیت کے ساتھ ہی سوٹ کرتے ہیں مثلاً صاف اور سلیس زبان میں لکھتے لکھتے وہ آخر میں کوئی ایسا جملہ تحریر کر دیتے ہیں جو اوپر دیئے گئے تمام پیراگراف کا ذائقہ یا تاثر تبدیل کر دیتے ہیں۔

یورپ میں سفر کے دوران لکھے گئے ابواب میں مصنف نے بعض اوقات ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ جیسے وہ خوابیدہ حالت میں ہوں رشک آمیز الفاظ یہ بتاتے کہ وہ دنیا کے دیگر انسانوں کی طرح انسانی خوبیوں اور خوبصورتیوں کی تعریف کرتے نہیں۔ جھجکتے صبح کی تعریف اور رات کے حسن کے بیان میں ایک رومانوی شخص ان کے ذہن روح میں سانس لیتا دکھائی دیتا ہے۔

> "رات کے پچھلے پہر جاگتی خوشبوؤں نے بازوں کا حلقہ تنگ کیا اور کہا" تمھیں تو سخت نیند آرہی تھی! " اس کے چہرے پر طلوع صبح کا حُسن تھا اور آواز میں پہاڑی نالوں سے گزر کر میدان میں بہتے ہوئے بانیوں جیسا ٹھہراؤ اور ترنم تھا۔ میں نے ٹھنڈی کرنوں والے سورج کو بوسہ دیا اور پھر اس وقت آنکھ کھلی جب کمرے کی کھڑکیوں کے باہر پرانی عمارتوں کے کلسوں پر دھوپ چمک رہی تھی اور زولا میرے لیے باورچی خانے میں ناشتہ تیار کرنے میں مشغول تھی۔" (۲۶)

مصنف کے اسلوب کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ کسی بھی جگہ کا مختصر سے مختصر نقشہ کھینچنے میں مہارت رکھتے ہیں مگر نفسیات، الفاظ کے چناؤ، دروبینی اور ماحول سے آگہی سمیت تمام فنی اجزا پیراگراف میں آجاتے ہیں۔ تحریر کا یہ انداز علامت نگاری اور مختصر نویسی کی ایسی مثال ہے جہاں کہیں کمی بیشی کا احساس نہیں ہوتا وہ انسان کی تصویر کشی میں ماحول کو لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا یہ انداز کم ہی سفر نامہ نگاروں کے ہاں ملتا ہے۔ مصنف نے اپنے اسلوب میں قدیم محاوروں اور تلمیحات کا خوبصورت استعمال ممکن بناتے ہیں۔ مگر عطاء الحق قاسمی علمیت کے اظہار اور فکر کی بلندی کے لیے مصنوعی ذریعہ استعمال نہیں کرتے بلکہ وہ ایسا طریقہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں جس کی بدولت تحریر کی شان و شوکت میں اضافہ ہو نہ کہ بے موقع اور بے محابا استعمال کی وجہ سے بھونڈا پن نظر آئے وہ محاوروں کی بجائے سلیس الفاظ سے گہرے مفاہیم اخذ کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں ایمائیت اور علاقبت کھل کر سامنے آتی ہے۔ وہ ایک اچھے خاکہ نگار ہیں۔ اس لیے ان کے سفر ناموں میں غیر محسوس طور پر خاکہ نگاری کی تراکیب اور طریقہ کار متعارف کروایا اور خاکہ بناتے ہوئے وہ نفسیاتی تجزیے کو ظاہری تجزیے پر زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ظاہر سے حقیقت کی طرف پہنچنا اور وہ بھی ایسے طریقہ کا استعمال جہاں مصنف خیالی الفاظ کا سہارا لینے کی بجائے جسمانی افعال اور چہرے کے تاثرات کا جائزہ ایک مشکل اور صبر آزما عمل ہے۔

ڈاکٹر فوزیہ چودھری ان کے فکر و فن اور اسلوب کے حوالے سے لکھتی ہیں:

"ان کے ڈراموں کی طرح ان کے سفر نامے فنی تاریخ اور جغرافیے کو کھنگالنے کی بجائے ہمیں دیس دیس کے انسانوں سے ملاتے ہیں۔ ان لوگوں کی عادات و اطوار، ان کا رہن سہن، ان کی گفتگو، ان کی حرکات و سکنات اُن کی نفسیاتی مسائل، ان کا تہذیب و تمدن کیا ہے جو کہیں کہیں عطاء الحق قاسمی ایک پر جوش مبلغ کا روپ دھار لیتے ہیں جو یہ بتاتا ہے کہ وطن عزیز کی خاطر دی گئی قربانیوں کی سنگینی کا انداز صرف وہ لوگ ہی لگا سکتے ہیں جو اس کرب سے گزرے ہوں۔ "دلی دور است" میں ایک حصہ بہت متاثر کن اور جذباتی ہے جس میں مصنف خود قاری کے ساتھ ساتھ ان تمام مقامات آہ فغاں تک پہنچتا ہے۔ جہاں پر پہنچتے قاری خود گلو گیر ہو جاتا ہے۔ اس طرح قاری بھی مصنف کے ہچکیاں لیتے ہوئے قلم کے ساتھ خود بھی سسکیاں لیتا ہوا دکھاتی ہے۔" (۲۷)

قصہ بر اس میں اس سفر نامے کا نچوڑ کہا جاتا ہے۔ یہ ہماری تاریخ کا وہ حصہ ہے جسے ہماری ہر نسل کو پڑھنا چاہیے تاکہ اس سے ہمارے دل میں اپنے وطن کی محبت چنگاری سلگتی رہے۔

"دعا سے فراغت کے بعد سند یونیورسٹی کے ایک نوجوان نے مجھ سے کہا:" یہاں آنے سے پہلے اکھنڈ بھارت کا قائل تھا اور سمجھتا تھا کہ دو قومی نظریہ غلط ہے۔ میری یہ گزارش ہے کہ آپ واپس جائیں تو یہ تجویز پیش کریں کہ جو لوگ اپنے دلوں میں پاکستان کے حوالے سے جو شکوک س شبہات رکھتے ہیں انہیں لا کر یہ کنویں دکھائے جائیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان تاریخی عوامل کے بغیر بنا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جنم لینے والی نسل کے افراد یہ کنویں دیکھ کر جان جائیں گے کہ بر صغیر کے تمام مسلمانوں نے اپنے دارالامان پاکستان کے لیے کتنی قربانیاں دی تھیں۔" (۲۸)

عطاء الحق قاسمی اس سفر نامے میں بھارت کے بارے میں تفصیل سے اپنے مشاہدات و تجربات کو بیان کرتے ہیں۔ جن کو پڑھتے ہمیں بھارت کی ثقافتی، تہذیبی زندگی کے بارے میں پتہ چل جاتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی ہمیں موازنہ مقابلہ کا موقع کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

عطاء الحق قاسمی نے بعض جگہ معترضہ جملوں کو استعمال کیا ہے۔ ہر معترضہ جملے نہ صرف حالات و واقعات کی مزید تفصیل دیتے ہیں بلکہ یہ فلسفیانہ خیالات کی ممکنہ اظہار پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جن کی وجہ سے سفر نامے کا پس منظر ایک نئے زاویے سے دیکھا جاسکتا ہے۔

> "اس وقت رات کا ایک بج چکا ہے مگر اندھیرے کی بجائے ہلکی ہلکی روشنی ابھی تک موجود تھی۔ میں نے بھابھی سے پوچھا کہ یہاں رات کب ہوتی ہے؟ تو انہوں نے بتایا کہ ایک آدھ گھنٹے کے لیے ہوتی ہے اور بس ایسی ہوتی ہے جیسی نظر آرہی ہے۔ ان کی رات بھی صبح جیسی ہے اور ہماری صبحیں بھی راتوں جیسی کیوں ہیں؟۔" (۲۹)

مندرجہ بالا اقتباس اس بات کی دلیل ہے کہ عطاء الحق قاسمی سیدھے سادھے اور سپاٹ انداز میں منظر کشی کرتے ہیں اور نہ ہی انسانوں کے حلیے پر زیادہ تبصرہ کرتے ہیں بلکہ واقع یا حالت کی وجہ سے کوئی نکتہ ان کے ذہن میں جنم لیتا ہے۔ اپنی بات کے لیے وہ گھوڑوں کو آگے پیچھے دوڑاتے ہیں۔ ایک دور کی گھوڑی لانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ وسیع مطالعے نے انہیں سفر ناموں میں فلسفیانہ رنگ بھرنے میں مدد دی ہے۔ وہ معاشی خوشحالی آزادیوں اور جمہوریت کے فوائد سے بھی واقف ہیں اور ان کے نقصانات کو بھی اپنے سفر ناموں میں جگہ دیتے ہیں البتہ پوری بات بیان کرنے کے باوجود ایک خاص قسم کی رمزیت اور ایمائیت ان کا پیچھا چھوڑ نہیں پاتی اور وہ ہر پہلو کے کچھ حصوں کو قاری کی سمجھ کے مطابق کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں ذو معنویت کا انداز بھی پایا جاتا ہے۔ یہ اسلوب کا وہ رنگ ہوتا ہے جس میں مصنف تحریر میں مزاح کے رنگ کے ساتھ ساتھ کہیں دردمندی بھی ملتی ہے۔ یہ بات وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ مزاح کے درپردہ بھی دردمندی کا جذبہ ہوتا ہے۔ ہمیں عطاء الحق قاسمی کے ہاں اجتماعی قومی زندگی کے حوالے بہت سے ملتے ہیں۔ اس کو بھی دردمندی کی علامت کہتے ہیں۔ جب گروپ لیڈر اپنے ساتھیوں کا ہاتھ کھینچتے اور ہوٹل میں منعقد شو کی طرف متوجہ کرتے ہیں تو عطاء الحق قاسمی کے خیال کی رو میں لیے ہوئے کہیں سے کہیں جا پہنچتے ہیں۔

"لیکن کھانے کو ہاتھ کون کھینچتا ہے؟

ہم لوگوں کو تو حکومت الٹانے سے اتنی دلچسپی نہیں ہوتی جتنی "کھانا کھانے" پر چیزیں الٹانے سے ہوتی ہے۔ جو لوگ حکومت میں ہوتے ہیں وہ یہ ہم لوگوں کی غلط فہمی ہے کہ انہیں حکومت سے دلچسپی ہوتی ہے۔ ان کی دلچسپی بھی صرف "کھانے" سے ہوتی ہے۔ اپوزیشن والے بھی ان کی حکومت الٹانے کے اتنے شوقین نہیں ہوتے بلکہ کھانے کی میز پر اپنی باری کے منتظر ہوتے ہیں۔" (۳۰)

اس اندازِ اسلوب کی وجہ سے عطاء الحق قاسمی کی ایک خاص پہچان ہے۔ انہوں نے اس اسلوب کو کالموں میں بھی بڑی کامیابی سے برتا ہے۔ اس اسلوب کا مقصد قاری میں سوچ کی لہر کو پیدا کرنا ہے کیونکہ مصنف آخر میں اجتماعی قومی حوالے سے ایسے چبھتی ہوئی بات کر دیتے ہیں جس سے قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور ان کے خیال میں سوچ اور فکری ترقی ضامن ہوتی ہیں۔

مصنف بطور انسان زبان کے استعمال میں بہت زیادہ مہارت رکھتے ہیں۔ اپنی مہارت کے بل بوتے پر وہ سنجیدگی اور مزاح دونوں کو اپنی اپنی جگہ پر رکھتے ہیں ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت ان کا مزاح سے سنجیدگی اور سنجیدگی سے مزاح کی طرف آنا بالفاظ دیگر ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ عطاء الحق قاسمی کی تحریر میں یکسانیت یا یک رنگی موجود نہیں ہے۔ وہ مزاح سے سنجیدگی پیدا کرنے اور کسی سنجیدہ نکتہ کو مزاحیہ روایتوں اور قواعد کے اصولوں اپنے مقصد کے لیے بے دریغ استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے ان میں توازن برقرار رکھنے میں مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کے تمام سفرناموں میں سنجیدہ نکتہ سے مزاح اور مزاحیہ عنصر سے سنجیدہ نکات پیدا کرنے کا سلسلہ موجود ہے۔ اس لیے بعض جگہ بے تکے بیان کرنے سے فرار حاصل کرنا چاہتے ہیں تاکہ فن اور فکر کے حوالے سے ان پر تنقید ہو انہیں دفاع کرنے میں آسانی ہو تاہم یہ بات ان کے کریڈٹ پر ہے لفظی بازی گری کے باوجود اپنے موضوع سے وابستگی ان سے طرز نگارش اور اسلوب کی نمایاں خصوصیت ہے۔ جس عام انسانوں کی طرح عام ہوٹلوں اور عام جگہوں پر کام کرتے ہیں اور کھانے پینے کی چیزوں کا ذرک مزاحیہ انداز میں کرنے کی کوشش

کرتے ہیں کسی نکتے کے مکمل بیان سے گریز اور فراریت کی جانب رجحان سے ان کے چالاک ہونے اور اپنے زورِ قلم کو دوسری جانب موڑنے کی کامیابیوں کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تحریر کے دوران نئے نکات کو پیدا کرنے سے گریز کرتے ہیں بلکہ بات سے بات نکالنے کی بجائے موجود نقطے کو بات سے جوڑنے کو اپنی مہارت کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کا یہ طریقہ علمی اور فکری انداز بیان کو جگہ دینے میں کامیاب ہوتا ہے۔

اس باب میں عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں موجود طنز کی مختلف صورتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ طنز کے لغوی معنی چوٹ کرنے کے ہیں یہ انسانی زندگی کا ایسا رویہ ہے جب کوئی اپنے ذہن میں بنائے گئے اعلیٰ ترین اخلاقی پہلوؤں اور سماجی روایات اور اقدار کی خلاف ورزی پر دوسرے شخص یا رویوں کو پرکھتا ہے لیکن اس پرکھ میں مثبت پہلوؤں کو نمایاں نہیں کرتا بلکہ منفی پہلو اس کی نگاہ میں زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ اس بابت میں دو اہم اصطلاحات کے معنی سمجھنا ضروری ہیں۔ طنز و مزاح اور طنز و تشنیع اول الذکر اصطلاح خالص اور تلخ تنقید کے زمرے میں داخل ہے جس میں لگی لپٹی رکھے بغیر ایسی تصویر کشی کی جاتی ہے جس میں سراسر منفی پہلوؤں کو بیان کیا جائے اور اصلاح کے نکتے کو نظر انداز کیا جائے۔ جبکہ مؤخر الذکر طنز کا ایسا پہلو ہے جس میں مزاح کے رنگ میں ہلکے پھلکے انداز میں چوٹ کرنے کو ترجیح دی جائے اور اصلاحی پہلو کو مزاح کے رنگ میں بیان کرنے کی کوشش ہو۔

عطاء الحق قاسمی نے اپنے سفر ناموں میں طنز و مزاح کے مختلف طریقوں کو برتنے کی کوشش کی ہے وہ سیدھے اور سپاٹ انداز کی بجائے بیانیہ مگر دلنشین انداز اختیار کرتے ہیں اور اندر کی کیفیات کو بیدار کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ ان کے طنز و مزاح میں پنجابی الفاظ کی کثرت سے پنجابی زبان اس لحاظ سے اردو زبان پر فوقیت رکھتی ہے کہ اس میں ذو معنی کیفیت زیادہ ہے۔ ایک ہی جملے یا لفظ کو کئی طریقوں سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ صرف الفاظ سے اتار چڑھاؤ سے ہی جملوں کی معنویت تبدیل ہو سکتی ہے۔ اردو زبان میں پنجابی کا یہ استعمال عطاء الحق قاسمی کی کامیابی کی دلیل ہے اور حق بات یہ ہے کہ یہ الفاظ بوقت ضرورت استعمال ہوتے ہیں جس سے بھونڈے پن کی بجائے حسین نگارش میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی چونکہ ایک ڈرامہ نویس بھی ہیں۔ پی ٹی وی کے کئی معرکتہ الآراء ڈرامے تخلیق کر چکے ہیں۔ اس لیے ان کی تحریر میں ڈرامایت کا عنصر بھی موجود ہے لیکن ان کی ڈرامائیت بھی تہہ دار ہے۔ وہ بات کرتے ہوئے اس کے دوسرے پہلو کو مدِ نظر رکھتے ہیں۔ عطاء الحق

قاسمی بعض اوقات بچوں جیسے تجسس کا مظاہرہ کرتے ہیں حالانکہ وہ ایک پختہ کار آدمی ہیں مگر ایسا تجسس بیدار کرنے کا مقصد ایسا مزاح پیدا کرتا ہے جس میں خوشی اور غم کی کیفیات ملتی ہوں۔ داستانی یا بیانیہ انداز کے ساتھ ساتھ وہ بطور حوالہ کسی واقعہ کا ضمناً ذکر بھی کر دیتے ہیں جس سے طنز کی شدت میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔

کچھ واقعات کو بیان کرتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اپنی جانب دیکھ کر اپنا مذاق اڑانے کے موڈ میں ہوں۔ حالانکہ اپنی جانب اشارہ سے ان کا مقصد اجتماعی سوچ کی منظر کشی ہے۔ عطاء الحق قاسمی بوقت ضرورت کھلنڈرے اور سنجیدہ پن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ انتہائی سنجیدہ موضوع میں ظرافت کا پہلو نکالتے ہیں اور ظریفانہ جملوں کے آخر میں ایسی بات کہہ جاتے ہیں جو پورے ماحول کو تبدیل کرنے اور سوچنے پر مجبور کر دے۔ شعروں کی تشریح اور ان میں من مرضی کے مطابق تبدیلی اور تشبیہات واستعارات کے استعمال سے ان کی زبان پر گرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اردو کے استاد اور غالب کے دلدادہ عطاء الحق قاسمی دیگر شعراء کے ساتھ ساتھ خاص طور پر غالب کی شاعری کے حوالوں کو بر محل پیش کرنے میں کمال دکھاتے ہیں اور نئے اشعار کی مدد سے طنز و مزاح کے نئے پہلو آشکار کرتے ہیں ان کی خصوصیت یہ ہے کہ مزاح پیدا کرتے ہوئے نہایت باریک نکات انتہائی آسان زبان بیان کر جاتے ہیں۔ بعض اوقات ان کے طنز کرنے سے دو سے زائد معانی بھی پیدا ہوتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی بات سے بات نکالنے کی بجائے موجودہ نقطے کو بات سے بات کو جوڑنے میں اپنی مہارت کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کا یہ طریقہ علمی اور فکری انداز بیان کو جگہ دینے میں کامیاب ہوتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ فوزیہ چودھری، ڈاکٹر، طنز و مزاح کے پچاس سال، نقد ظفر افت، پولیمر پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص22

۲۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اشاعت دوم، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص۳۶

۳۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۴۷۸

۴۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۴۲۲

۵۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۳۴

۶۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۴۴۳

۷۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۸۸

۸۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۱۰۶

۹۔ فوزیہ چودھری، ڈاکٹر، طنز و مزاح کے پچاس سال، نقد ظرافت، پولیمر پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص۱۲۱

۱۰۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۱۳۶

۱۱۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۲۷۵

۱۲۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۲۷۷

۱۳۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۲۸۲

۱۴۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۲۸۳

۱۵۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۷۴۱

۱۶۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۵۰۶

۱۷۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۸۰۲

۱۸۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۳۷۲

۱۹۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۲۷۲

۲۰۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۳۰۹

۲۱۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۳۷۱

۲۲۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۴۰۳

۲۳۔ آرڈی بلیک مین، بحوالہ طارق سعید، اسلوب اور اسلوبیات، نگارشات پبلشرز،، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص۱۸۳

۲۴۔ والٹر یٹر، بحوالہ طارق سعید، اسلوب اور اسلوبیات، نگارشات پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص۱۷۲

۲۵۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۱۲۵

۲۶۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۱۵۶

۲۷۔ فوزیہ چودھری، ڈاکٹر، طنز و مزاح کے پچاس سال، نقد ظرافت، پولیمر پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص

۲۸۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۱۱۶

۲۹۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۳۲۳

۳۰۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۳۸۲

باب چہارم:

عطاء الحق قاسمی کا ہم عصر سفر نامہ نگاروں کے ساتھ سماجی طنز کے تناظر میں

الف: عطاء الحق قاسمی بطور سماجی طنز نگار

ادیب سماج کا انتہائی حساس عنصر ہوتا ہے۔ سماج میں پائی جانے والی کوتاہیوں اور ناہمواریوں کو مختلف انداز میں دیکھتا اور انہیں بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔ ادیب کی سوچ اور فکر ان سماجی ناہمواریوں کو ایک خاص زاویے سے دیکھتی ہے۔ اس کی نظر ان سماجی کوتاہیوں تک بھی پہنچ جاتی ہے جو عام انسان کی آنکھ اور سوچ سے اوجھل ہوتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ادیب کے ہاں سماجی کوتاہیوں اور ناہمواریوں پر ایک خاص انداز میں خامہ فرسائی ملتی ہے۔ ادیب کے ہاں سماجی ناہمواریوں اور کوتاہیوں کو بیان کرنے کا جو اہم ذریعہ ہے وہ سماجی طنز ہے۔ وہ معاشرے میں پھیلی برائیوں اور ناہمواریوں کو دیکھتا ہے اور ان کو اس طرح طنزیہ انداز میں بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والی نظر ان اسرار کو پالیتی ہے جن سے اس سے قبل وہ غافل تھا۔ یہ ادیب کے فن کا کمال ہے کہ وہ لطیف انداز میں سماج میں پائے جانے والے مسائل اور دیگر منفی امور کو بے نقاب کرتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ادیب سماج کا حساس فرد ہونے کے ناطے ان سماجی ناہمواریوں سے عام شخص کی نسبت بہتر انداز میں سمجھنے کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ وہ سماج میں ہونے والی ہر دم تغیر کی صورت حال سے بخوبی باخبر رہتا ہے اور اس بدلتی صورت حال میں سماج کی بہتری کے لیے اپنا فرض پورا کرنے کے لیے خود کو آمادہ رکھتا ہے۔ سماج کی تبدیلی دیگر انسانوں کی طرح اسے بھی خوب متاثر کرتی ہے جس طرح انسان سماج سے متاثر ہوتا ہے اسی طرح سماج بھی انسان سے اثر قبول کرتا ہے۔ سماج اور انسان ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کرتے ہیں۔ اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد افضال بٹ لکھتے ہیں:

"سماج کے بغیر انسان بے معنی ہوتا ہے، سماج انسان کو بے شمار طریقوں سے متاثر کرتا ہے جوں جوں معاشرے کی تہذیب و ثقافت میں تبدیلی رونما ہوتی ہے یوں یوں سماج بھی تبدیلی کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔ جس طرح سماج کے بغیر انسان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی اس طرح انسان کے بغیر سماج کا کوئی ڈھانچہ نہیں بن سکتا۔ انسانی رویے اور رجحانات ہی سماج میں تغیر و تبدل پیدا کرتے ہیں۔" (۱)

انسانی روّیوں اور رجحانات کے حوالے سے دیکھا جائے تو دنیا کے مختلف خطوں میں موجود مختلف اقوام کے روّیے اور رجحانات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ان رویوں اور رجحانات میں پایا جانے والا یہ اختلاف ہی متنوع سماج پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔ وہ متنوع سماجوں میں پائی جانے والی ناہمواریوں کی نوعیت بھی مختلف ہوتی ہے یہ ایک ادیب کی نظر ہوتی ہے جو ہر سماج میں پائی جانے والی کوتاہیوں اور ناہمواریوں کو اس سماج کے مناظر میں دیکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ ادیب کی تحریروں میں دُنیا کے مختلف معاشروں کے حوالے سے آراء ملتی ہیں یہ آراء بعض اوقات لطیف طنز کی صورت میں ہوتی ہیں۔

طنز کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس بارے میں مختلف ناقدین کی مختلف آراء سامنے آتی ہیں۔ بعض کے نزدیک طنز برائی کو سامنے لانے کا نام ہے تو بعض اسے رسمی لطیف سرگرمی قرار دیتے ہیں جو سماج کے کسی رویے یا پہلو کے منفی زاویوں کو اس طرح اجاگر کرتا ہے کہ قاری غیر محسوس انداز میں ان کی حقیقت تک بڑھتا چلا جاتا ہے فیصل لیاقت علی طنز کو جراحت سے مشابہ قرار دیتے ہیں۔ وہ اپنے ایک مضمون میں طنز پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"طنز ایک بے دردانہ تنقید ہے جسے علم جراحی سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ عام تنقید میں توازن ہوتا ہے جب کہ طنز میں اعتدال قائم نہیں رکھا جاسکتا۔ دوسرے لفظوں میں ہمارے چار سو جو بے اعتدالیاں اور ناہمواریاں نظر آتی ہیں ان پر برملا اظہار خیال کرنا طنز ہے۔ ادب میں اس کی اہمیت اس کی مقصدیت کی وجہ سے ہے جس کی وجہ سے طنز کی تلخی بھی گوارا کرلی جاتی ہے۔" (۲)

فیصل لیاقت علی کے اس قول سے بہت سے حوالوں سے اختلاف کی گنجائش بھی نکلتی ہے۔ وہ طنز کو جراحت سے تشبیہ دیتے ہیں لیکن حقیقت میں طنز میں جراحت کی سی کاٹ نہیں ہوتی۔ اس کا انداز لطیف ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ طنز نگار برملا یا براہ راست اظہار خیال کرنے کی بجائے اشاروں کنایوں میں اپنی بات کہہ جاتا ہے۔ طنز ایک سماجی سرگرمی ہے سماج کا ہر باشندہ کسی نہ کسی حد تک سماج اور اس میں بسے والی مختلف چیزوں کے حوالے سے ناہمواریوں کو دیکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں کم یا زیادہ جملے بولتا رہتا ہے۔ یہ سب کچھ سماجی طنز میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

سفر نامے میں سماجی طنز نگاری کے حوالے سے اردو ادب میں بہت سی ادبی شخصیات ایسی ملتی ہیں جنھوں نے سماجی طنز نگاری سے کام لے کر کامیاب سفر نامے تخلیق کیے ہیں۔ ان شخصیات نے نہ صرف مختلف ممالک کے سماج کے مثبت پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے بلکہ سماجی طنز سے کام لیتے ہوئے ان سماجوں کی ناہمواریوں اور منفی رویوں کو بھی بیان کیا ہے۔ ان ادبی شخصیات میں ایک نام عطاء الحق قاسمی کا ہے۔

عطاء الحق قاسمی نے مشرق و مغرب کے ممالک کے بہت سے سفر کیے۔ ان کے یہ اسفار بعض تو سیر وسیاحت کی غرض سے تھے اور بعض حکومتی امور کی انجام دہی کے لیے۔ ان اسفار میں انہیں ان ممالک کے جغرافیائی حالات، تہذیبی اقدار اور ثقافتی عوامل کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ انھوں نے ان ممالک کی معاشرت اور سیاحت کا خود مشاہدہ کیا اور اپنے اسفار میں ان کا بیان کیا۔ سماجیات کے حوالے سے عطاء الحق قاسمی کی خدمات قابل قدر ہیں۔ انہوں نے اپنے اسفار کے ساتھ ساتھ کالموں میں مختلف سماجی اقدار کی پامالی اور سماجی رویوں کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ سماجی طنز نگار کی حیثیت سے خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کے اسفار میں مختلف ممالک اور مختلف اقوام کے سماجوں میں پائی جانے والی ناہمواریوں پر گہرا طنز ملتا ہے۔ وہ طنز کو تنقید برائے تفنن طبع کا ذریعہ نہیں بنانا چاہتے بلکہ ان کا طنز اس لطیف انداز میں ملتا ہے کہ اصلاحِ سماج کے مقصد کی ترجمانی کرتا نظر آتا ہے۔ سماج پر طنز کرنے کا ان کا بڑا مقصد ہی اس سماج میں پائی جانے والی ناہمواریوں کو سامنے لاتا ہے۔

مشرق کے لیے مغرب خاصی کشش کا باعث ہے۔ مشرقی نوجوان مغرب کی ترقی کی ظاہری چکاچوند سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ وہاں جانے کی خواہش ہر دل ہی دل میں پالتے رہتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو ایسے بھی ہوتے ہیں جو ساری عمر کی جمع پونجی خرچ کر کے مغرب کو عازم سفر ہو جاتے ہیں۔ آنکھوں میں شاندار اور سنہرے

مستقبل کے خواب سجائے یہ لوگ جب مغرب میں پہنچتے ہیں اس سماج کا ساتھ دینے اور وہاں اپنے آپ کو سیٹل کرنے میں انہیں خاصی دشواری پیش آتی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ مغرب کے جس چکاچوند سے متاثر ہو کر یہ لوگ وہاں گئے ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہاں کے سماج میں بہت سے مسائل بھی ہوتے ہیں جن کا وہ ادراک نہیں کر پاتے۔ عطاء الحق قاسمی نے اس سماج میں پائے جانے والی ناہمواریوں کو طنز کا نشانہ بنا کر یوں پیش کیا ہے کہ قاری ان کے سفر نامے پڑھنے کے بعد مغرب کے اصل چہرے سے واقف ہو جاتا ہے۔ وہ ظاہری چکاچوند کی تہہ میں چھپے ان مسائل کا ادراک کرنے کے بھی قابل ہو جاتا ہے جنھوں نے اس سماج کے حسن کو گہن لگا رکھا ہے۔

سماجی طنز نگاری کے مختلف زاویے میں جس طرح سماج کے مختلف زاویے ہوتے ہیں۔ مختلف سماجی جہات ہوتی ہیں جس میں لوگوں سے برتے گئے رویے، سماجی باشندوں کے ذہنی رجحانات، سماجی منظر نامے کی تشکیل میں حصہ لینے والے دیگر عناصر شامل ہوتے ہیں ایسے ہی ایک سماجی طنز نگار ان مختلف سماجی جہات کو سامنے رکھتے ہوئے مختلف سماجی ناہمواریوں کو عیاں کرتا ہے۔ کہیں تو وہ سماجی باشندوں کے رجحانات اور رویوں کو طنز کا نشانہ بناتا ہے تو کہیں وہ سماج مجموعی عادات پر طنز کرتا ہے۔ یہ عادات ایسی ہوتی ہیں جو اس سماج کی پہچان بن جاتی ہیں۔

مغربی ممالک کے سماج میں دوغلا پن نمایاں ہے۔ اپنے بارے میں اور خیالات اور رجحانات جب دیگر کے بارے میں انہی خیالات و رجحانات کے بالکل برعکس رویے اس سماج میں عام ہوتے جا رہے ہیں۔ وہاں کے سماج میں رہنے والے باشندے خود کو دوسروں سے برتر ثابت کرنے کے لیے یہ دوغلا پن اپنائے ہوئے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی نے اپنے سفر ناموں میں ان کے اس سماجی رویے کو بڑے لطیف انداز میں طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ انہوں نے بظاہر ایک لباس کی مثال دی ہے لیکن ایک ماہر فن کی طرح وہ اس سماج میں پائے جانے والے سے دوغلے پن کو نمایاں کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس کی ایک مثال یوں لے لیجئے کہ دھوتی ہمارے پنجابی سماج کا ایک مقبول لباس ہے۔ اگر مغربی لباس کے ساتھ اس کا موازنہ کیا جائے تو فحاشی و عریانی میں مغربی لباس دھوتی کی نسبت بہت آگے بڑھا ہوا ہے لیکن مغرب اپنے فحش لباس کو بھول کر دھوتی کو کسی طرح فحاشی کے زمرے میں رکھ کر دیکھتا ہے اس کی ایک مثال عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں ملتی ہے۔ وہ ایک جگہ لطیف انداز میں سماجی طنز نگاری کرتے ہوئے مغرب کی سوچ کو یوں عیاں کرتے ہیں:

"کچھ دیر میں بعد وہ لوٹا تو اس نے پینٹ قمیص کی بجائے کرتا اور دھوتی پہنی ہوئی تھی اور کاپلو ایک ہاتھ سے اسی طرح اوپر اٹھایا ہوا تھا جس طرح اسے اٹھایا جانا چاہیے یا یوں کہہ لیں کہ جس طرح ہمارے ہاں ارد گرد سے نظریں بند کر کے اٹھایا جاتا ہے۔ دوغلے اخلاقی معیاروں کے حامل یورپی معاشرے میں یہ لباس فحاشی کے ذیل میں آتا ہے۔"(۳)

بظاہر دیکھا جائے تو دھوتی اور یورپی لباس میں فحاشی کے حوالے سے کوئی موازنہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ کہاں یہ ستر کو ڈھانپتا لباس اور کہاں وہ چست پاجامے، منی سکرٹ، ٹائٹ جینز اور بلاؤزر جو فحاشی و عریانی پھیلانے کے ساتھ شہوت انگیز بھی ہوتے ہیں لیکن یورپی سماج میں پائے جانے والے دوغلے پن میں ان کے اپنے لباس کی یہ ساری خرابیاں قابل قبول بلکہ ان کے نزدیک مستحسن ہیں پنجابی لباس ان کے لیے فحاشی کا ذریعہ قرار پاتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے بڑے لطیف انداز میں اس سماج میں پائی جانے والی اس ذہنی روش کو آشکار کیا ہے۔

قاری سماجی منظر نامے کی عکاسی کرتے ہوئے بعض اقوام اور ان کے سماج کو یوں طنز کا نشانہ بناتے ہیں کہ ان کی خاص پہچان بھی سامنے لے آتے ہیں۔ ان کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ اس سماج کے باشندوں میں پائے جانے والی عیاری اور مکاری بھی کھل کر سامنے آنے لگتی ہے۔

دنیا بھر میں امریکہ نے اپنی چودھراہٹ قائم رکھنے کے لیے جو شاطر طریقے اپنائے ہیں اور جس انداز میں لوگوں کو اپنا محکوم بنانے کی مہم چلا رکھی ہے۔ اس نے امریکی سماج کے چہرے کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ امریکہ میں باشندے بھی حکمرانوں کی طرح دوسروں کو اپنے سے کم تر سمجھتے ہیں۔ رعونت اور تکبر ان کے چہرے سے عیاں ہوتا ہے۔ وہ دنیا میں جہاں کہیں بھی جائیں دوسروں کو اس طرح حقارت کی نظ سے دیکھتے ہیں کہ وہی حقارت کی نظر ان کی خاص پہچان بن جاتی ہے۔ عطاء الحق قاسمی کو امریکی سماج کو انتہائی قریب سے دیکھنے اور جانچنے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ مختلف ممالک میں بطور سفیر فرائض انجام دینے کے دوران انھوں نے مختلف اقوام کے باشندوں کے عادات و اطوار کا بھی خوب مشاہدہ کیا تھا اور ان میں پائے جانے والے سماجی اور اخلاقی رویوں کو بھی خوب پرکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ امریکی باشندوں کی عادات و اطوار اور دوسروں کے حوالے سے اس سماج میں روا

رکھے جانے والے رویوں سے بخوبی آگاہ ہیں۔ ان کے نزدیک امریکی سماج میں رہنے والے لوگ اپنی خاص پہچان رکھتے ہیں۔ اس پہچان کا انہوں نے ذکر تو نہیں کیا لیکن ساتھ جو مثال دی ہے وہ اس سماج کے منفی رویوں اور دوسروں کے حوالے سے غلیظ رائے قائم کرنے کی عکاسی کرتی ہے۔ امریکی سماج پر طنز کی ایک لطیف مثال دیتے ہوئے عطاء الحق قاسمی لکھتے ہیں:

"تم خاصے کی چیز ہو، کہاں سے آرہے ہو، اس نے گفتگو میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا:

"جہاں سے تم آرہی ہو"

"میں تو امریکہ سے آرہی ہوں، تم بھی ادھر ہی سے۔۔۔۔۔۔"

"ہاں۔ میں بھی ادھر ہی آرہا ہوں اور اب اپنے وطن کی واپسی ہے"

"تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ میں امریکی ہوں؟"

"جس طرح احمق شخص کے چہرے پ لکھا ہوتا ہے کہ حضرات میں احمق ہوں، اسی طرح ہر امریکی اپنے امریکی ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہوتا ہے۔ (۴)

اس مکالمے میں عطاء الحق قاسمی نے لطیف طنز کے ذریعے امریکی سماج کی عکاسی کی ہے اور مجرموں نے احمق کی مثال پیش کر کے امریکی سماج اور اس سماج میں رہنے والے باشندں کے ذہنی رویوں اور سماجی رجحانات کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے لیکن انہوں نے انداز ایسا اختیار کیا ہے کہ خود امریکی بھی اسے ناگوار نہیں سمجھتے۔ یہی ایک ماہر سماجی طنز نگار کی بڑی خوبی ہوتی ہے کہ وہ سماجی ناہمواریوں کا تذکرہ یوں کرتا ہے کہ صورت حال کو مضحکہ خیز نہیں بننے دیتا۔ یہی فن عطاء الحق قاسمی کے ہاں عروج پر نظر آتا ہے۔ وہ ذہنی رویوں اور سماجی رجحانات کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ ان میں پائی جانے والی ناہمواریوں کو بھی عیاں کرتے ہیں، ان کے ہاں صورت حال کو ایسے دبا کر پیش کرنے کا رجحان ملتا ہے جس میں حقیقت نظر آتی ہے لیکن یہ حقیقت تلخ ہونے کے باوجود قاری سے اس انداز میں ملتی ہے کہ صورت حال مضحکہ خیز نہیں بننے پاتی بلکہ قاری غور و فکر پر آمادہ نظر آتا ہے۔ وہ اس سماج میں پائی جانے والی ناہمواریوں سے سیکھتا چلا جاتا ہے اور سماج کا اصل چہرہ اپنی تمام مصائب و محاسن کے ساتھ اس کے سامنے آنے لگتا ہے۔ حقیقی سماجی طنز نگار کا اصل فریضہ بھی یہی ہوتا ہے کہ وہ صورت حال کو بگاڑ کر پیش کرنے یا

صحافیانہ انداز اپنانے کی بجائے اصل حقائق کو لطیف طنز کے ساتھ پیش کرے۔ اس طنز کی کیفیت یا رغبت ایسی ہو کہ قاری قہقہے لگا کر ہنسنے کی بجائے تبسم زیر لب سی کیفیت سے دوچار ہو اور اس صورت حال پر تفکر کو عروج کی طرف لے کر جائے۔

سماجی حوالے سے دیکھا جائے تو دنیا میں ایسی اقوام جو پسماندہ ہیں ان کی تہذیب میں پسماندگی کا شکار نظر آتی ہے۔ یہ ایسی اقوام ہوتی ہیں جو مالی آسودگی سے آشنا نہ ہونے کے ساتھ ساتھ ذہنی طور پر پسماندگی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ان اقوام کے ہاں تہذیب زوال پذیر نظر آتی ہے۔ سماجی سطح پر ایسی اقوام کی عادات غیر مہذب اور بعض اوقات وحشیوں جیسی ہوتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف بھی ان کا دھیان اس طرح نہیں جاتا جیسے مہذب اور شائستہ لوگوں کا دھیان ہوتا ہے۔ وہ بظاہر عام چیزوں کو نظر انداز کر رہے ہوتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کے نظر انداز کرنے کا یہ عمل انہیں تہذیب کے دائرے سے نکال کر غیر مہذب لوگوں میں شامل کرنے کا باعث بن رہا ہے۔ ایسی ہی صورت حال کا سامنا عطاء الحق قاسمی کو اپنے سنگاپور کے سفر کے دوران کرنا پڑا۔ سنگاپور جو کہ قدرتی حسن سے مالا مال خطی ہے لیکن وہاں بعض اقوام سماجی سطح پر جس بد تہذیبی کا شکار ہے اس کا ذکر عطاء الحق قاسمی ایک سفر نامے میں طنزیہ انداز میں یوں کرتے ہیں:

> "میں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور سگریٹ سلگانے کے بعد ویٹر سے جس نے بائیں کاندھے پر "پرنا" ڈالا ہوا تھا۔ ایش ٹرے لانے کے لیے کہا۔ اس نے فرش کی طرف اشارہ کیا۔ "جناب یہ سب ایش ٹرے ہے" اور وہ صحیح کہتا تھا، فرش پر جگہ جگہ سگریٹ کے بجھے ہوئے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ پسماندہ اقوام کے لوگ دنیا کے جس کونے میں بھی ہوں وہاں اپنا ایک چھوٹا سا وطن ضرور آباد کر لیتے ہیں۔"(۵)

اس بیان کو دیکھیں تو عطاء الحق قاسمی نے پسماندہ اقوام پر بڑا لطیف طنز کر رہا ہے کہ سماجی حوالے سے یہ اقوام اس قدر پسماندگی کا شکار ہوئی ہیں کہ بنیادی تہذیبی اور اخلاقی اقدار بھی بھول جاتی ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اگر ان اقوام کے چند باشندے کہیں اکٹھے ہو جائیں تو ان کی طرف سے ہونے والی بد تہذیبی اور بد اخلاقی ان کے

مسکن کو چند ہی دنوں میں ایسے بنا دیتی ہے جیسے وہ اپنے وطن میں ذہنی پسماندگی اور بد تہذیبی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ سگریٹ سلگانے کے لیے ایش ٹرے پاس رکھنے تک کے روادار نہیں۔ جس کی وجہ سے نہ صرف ان کی اپنی بد تہذیبی ظاہر ہوتی ہے بلکہ پورا سماج ان سے متاثر ہونے لگتا ہے۔ یہ آج کے دور کا بہت بڑا المیہ ہے کہ مالی اور سماجی حوالے سے پسماندگی کا شکار اقوام تہذیبی و اخلاقی حوالے سے بھی پسماندگی کا مظاہرہ کرنے لگتی ہیں۔ عطاء الحق قاسمی نے اپنے سفر ناموں میں ایسی اقوام پر گہرا طنز کیا ہے۔

مغرب کا سماج جس نہج پر چل نکلا ہے وہ اپنے خنجر سے تہذیب کی خودکشی کے مترادف ہی ہے۔ مغرب نے عورت کو گھر کی چار دیواری سے نکال کر اسے حقوق کا لالچ دے کر جب بازار میں لایا تو وہی عورت اپنی عزت و ناموس سے محروم ہوئی تھی اس سماج کے لیے بھی کلنک کا ٹیکہ بن گئی۔ سماج میں جن برائیوں نے رواج پایا ان کی جڑیں انہی نام نہاد حقوق نسواں سے نکلتی نظر آتی ہے۔ مغرب میں عورت کس حد تک پسماندگی کا شکار ہو چکی اس سماجی المیے کو بیان کرتے ہوئے عطاء الحق قاسمی یوں طنز کے نشتر چلاتے ہیں:

> "وہ کیا؟ تجسس کے جذبے نے میرے اندر سر ابھارا اور میں نے واپس کرسی پر بیٹھے ہوئے پوچھا۔
>
> "وہ یہ کہ تمہارے ہر دو ذوق پورے کرنے کے علاوہ کوئی زائد رقم وصول کیے بغیر میں تمہارے برہنہ جسم پر پیشاب کی گرم گرم دھار بھی مارنے کو تیار ہوں۔۔۔۔۔ میرے سامنے سفید دبستانوں والے قاتل نظام کی ایک اور گلی سڑی لاش پڑی تھی جیسے خوب صورت ملبوسات میں ڈھانپ دیا گیا تھا۔ میں نے اس پر آخری نظر ڈالی اور باہر نکل آیا۔"(۶)

اس اقتباس کی آخری سطور میں گہرا سماجی طنز موجود ہے۔ مغرب کے سماج میں پائی جانے والی منافقت اور دوغلا پن عیان ہو رہا ہے۔ وہ مغرب جس کے نظام کو اقبال نے چہرہ روشن اور اندرون چنگیز سے تاریک کیا تھا یہ حقیقت عطاء الحق قاسمی کے بیان کو ظاہر کرتی ہے۔ سفید داستانین اس طنز کو ظاہر کرتی ہیں جو مغربی سماج پر کیا

گیا ہے۔ وہ اندر سے کس قدر کھوکھلے ہیں اس کا اندازہ مذکورہ بیان سے ہوتا ہے اور اس کھوکھلا پن میں وہ کس قدر بے ہودہ ہوگی اور بد تہذیبی کا شکار ہو جا رہے ہیں۔ اس پر قاسمی کے ہاں گہرا طنز ملتا ہے۔ مغرب اپنے سیاہ کرتوتوں کو خوبصورت لبوسات میں چھپانے کی سعی کرتا ہے لیکن اس کے سماج میں پائی جانے والی ناہمواریاں اور بد تہذیبی کے ساتھ ساتھ بد اخلاقی کہیں نہ کہیں سے خود اپنے آپ کو ظاہر کر دیتی ہے۔ مغرب کی ظاہری چکاچوند میں پڑ کر خود کو برباد کر دینے والوں کے لیے اس میں خاصا سبق موجود ہے کہ ظاہری چکاچوند اور ظاہری خوب صورتی انسان کے باطن میں چھپی خباثت اور بد تہذیبی کو زیادہ دیر تک چھپائے نہیں رکھ سکتی۔

پسماندہ اور غلام اقوام اگر ذہنی اور فکری حوالے سے بھی پسماندگی کا شکار ہو جاتیں تو ان کی سماجی صورت حال کو بہتری کی طرف گامزن ہونے کے لیے خاصا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ انگریز نے ایک عرصہ تک اس خطے پر حکمرانی کی۔ یہاں کی صرف اس نے دولت اور وسائل ہی نہیں لوٹے بلکہ یہاں کی تہذیب و ثقافت اور رواداری کے ساتھ ساتھ یہاں کی اعلیٰ فکر صلاحیتوں کو بھی نقصان پہنچایا۔ یہی وجہ ہے کہ اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود بھی اکثر لوگ آنا بھی انگریز کے غلام ہی نظر آتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی نے خود کو محکوم کی سطح پر رکھ کر حالات پر اس لطیف انداز میں طنز کیا ہے کہ انگریز کو آج بھی آقا ماننے والے سامنے آتے نظر آتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ انگریز کے یا مضبوط سماجی، سیاسی اور معاشی حالات ہیں اس کے مقابلے میں انگریز سے آزادی حاصل کرنے والے لوگ آج بھی بہت سے مسائل کے حل کے لیے انگریزی کی طرف دیکھنے کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔

عطاء الحق قاسمی نے بظاہر تو خود کو انگریز کا غلام کہا ہے لیکن حقیقت میں انھوں نے اپنی ذات کے ذریعے پوری قوم پر طنز کیا ہے جن کے نزدیک انگریز کو اب بھی آقا کا درجہ حاصل ہے۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

> ”کچھ لوگ واقعی ہنس رہے تھے اور کچھ ہنسنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ سامنے والی نشست پر بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے انگریز کو گونج دار قہقہے لگاتے ہوئے دیکھ کر میں نے بھی اس کی باتوں پر کان دھرا۔ اس کے لب و لہجے سے پہلے تو گمان گزرا کہ وہ انگریزی کی بجائے کوئی اور زبان بول رہا ہے اور پھر غور کرنے پر یہ گمان یقین میں نہ بدل سکا تو اپنے

انگریز آقا کی تقلید میں اس کی گلابی انگریزی پر ایک زور دار قہقہہ لگانے کے بعد میں نے اپنے سر دوبارہ کھڑکی کے باہر کیا اور نہر کے کنارے کھڑے نیلے پیلے پھولوں والے درختوں کے عکس پانی میں دیکھنے لگا۔"(۷)

اس اقتباس میں انہوں نے خود کو انگریز کا غلام اور انگریز کو اپنے آقا کی جگہ پر رکھ کر دکھایا اور بعد میں انگریز کی ہنسی پر بے وجہ قہقہہ لگانا بھیاس سماجی اور ذہنی پسماندگی کو طنزیہ انداز میں ظاہر کرتا ہے جو اس پسماندہ اقوام کا مقدر ہوتی ہے۔ یہ پسماندہ اقوام سماجی سطح پر ذلت کے گڑھے میں گرتی چلی جاتی ہیں۔ عطاء الحق قاسمی نے اس بیان میں سماج پر ایک لطیف طنز بھی کیا ہے خاص طور پر ان لوگوں پر جن سے جان پہنچانے کو کوئی بھی کام نہ ہونے کے باوجود بحث کرتے نظر آتا ہے۔ اس بحث میں بھی وہ صرف ہاں میں ملانے کی حد تک کار ہتا ہے یہ ذہنی غلامی اور تہذیبی ابتری کی بہت بڑی مثال ہے جو سماجی طنز کے ذریعے عطاء الحق قاسمی نے بیان کی ہے۔

مغربی سماج نے صنعتی میدان میں قدم رکھا تو پیسہ ہی ان کا مطمع نظر ٹھہرا۔ پیسے کی دوڑ لگی تو ہر ایک نے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ پیسہ حاصل کرنے کی سعی کی اور اس دوڑ میں یوں شریک ہوا کہ قریبی رشتے نامے سب بھول گئے۔ وہ قریبی رشتے دار جن سے انسان بہت کچھ سیکھتا ہے وہ سب بے معنی قرار پائے۔ یہاں تک کہ وہ والدین جنھوں نے خون جگر جلا کر بچے کی آرزوؤں کے گلشن کو سینچا ہوتا ہے وہ بھی غیر ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے لیے اولڈ ہومز کی لعنت ایجاد کی گئی یہ اولڈ ہومز ایسے ہوتے ہیں جو نہ صرف بوڑھے والدین کو بچوں سے دور کرتے ہیں بلکہ ان کی ایجاد نے سماجی سطح پر خاصا تغیر پیدا کیا ہے۔ وہ نانی، دادی جو اپنی جان سے بڑھ کر بچوں کا خیال رکھا کرتی تھیں اور بچوں کو اخلاقی و تہذیبی اقدار سے روشناس کرواتی ہیں اولڈ ہومز نے بچوں سے وہ نانی، دادی اور وہ اخلاقی و تہذیبی اقدار بھی چھین لی ہیں جس کے نتیجے میں ہی بچے بڑے ہو کر والدین کے یوں سامنے کھڑے ہوتے ہیں کہ ایک دن والدین کا سب کیا دھرا خاک ہو جاتا ہے اور وہ چپکے سے اپنی گٹھڑی اٹھا کر اولڈ ہومز جانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ جب چل نکلتا ہے تو پھر چلتا ہی چلا جاتا ہے۔ ایک کے بعد دوسری نسل بڑھاپے میں اپنی اولڈ ہومز کی تربیت میں چلی جاتی ہیں۔ یہ سب کچھ صنعتی ترقی اور اس ترقی میں بڑھ کر انسان کے

اخلاقی و تہذیبی اقدار سے عاری ہو جانے کی وجہ سے ہوا۔ عطاء الحق قاسمی نے اپنے مغرب کے سفر ناموں میں اولڈ پیپلز ہومز کو گہرے طنز کا نشانہ بنایا ہے اس کے ساتھ ساتھ صنعتی نظام کا بھی اس کے طنز کی کاٹ سے محروم نہیں رہ سکا۔ وہ سماج کے اس المیے کو گہرے سماجی تناظر میں دیکھتے اور دکھاتے ہیں۔ وہ والدین جن کے بارے میں اولاد کو دعا گو ہونے کا حکم دیا گیا ہے صنعتی ترقی نے اولاد اور والدین کے درمیان رشتے کو نہ صرف کمزور کیا ہے بلکہ سماجی منظر نامے کو بھی متاثر کیا ہے ایسے ہی ایک اولڈ پیپلز ہومز مین ایک بوڑھے شخص کے ساتھ ہونے والی گفت گو کو تخیل کی آمیزش سے انھوں نے اسے قاری تک پہنچایا ہے کہ ان کا انداز بیان سماجی طنز نگار کا عمدہ نمونہ بن گیا ہے۔ اولڈ پیپلز ہومز میں ہونے والی ملاقات کے احوال بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> "اس لمحے مجھے بوڑھے کی آنکھوں میں ویرانیاں تیرتی نظر آئیں۔ اس نے اپنی کہنیاں میز پر ٹکاتے ہوئے میری طرف دیکھا اور کہا بیٹے اگر تم لوگ بھی صنعتی ترقی کے دور میں گزرو، تو اس کی نعمتوں سے ضرور بہرہ ور ہونا لیکن اس کے لیے ان نعمتوں کی قربانی نہ دینا جن کا کوئی نعم البدل نہیں۔"(۸)

بوڑھے شخص کا یہ بیان نہ صرف اس سماج کی ابتری کی عکاسی کرتا ہے بلکہ یہاں جو انداز تحریر قاسمی نے اپنایا ہے وہ سماجی طنز نگاری کا بہترین نمونہ ہے، مغرب نے صنعتی ترقی کے فوائد خوب سمیٹے لیکن ان فوائد کے بارے میں انھوں نے اپنے والدین اور عزیز و اقارب جیسی عظیم نعمتوں کی قربانی دی۔ قربان ہونے والی نعمتیں ایسی تھیں جن کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ انسان خواہ سماجی زندگی کے کسی بھی درجے پر کیوں نہ پہنچ جائے خواہ کتنی ہی دولت کیوں نہ اکٹھی کر لے۔ رشتے داریاں اور خاص طور پر والدین کا نعم البدل ہر گز نہیں پا سکتا۔ مغرب کے سماج کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ سماجی سطح پر خوشحالی ہونے کے باوجود اس سماج میں تہذیبی و اخلاقی اقدار مٹتی چلی جا رہی ہیں۔ ان کے بدلے میں عریانی، فحاشی اور غیر اخلقی امور نے لے لی ہے۔ جس کی وجہ سے مغرب کی ناؤ سماجی حوالے سے ڈوبتی نظر آ رہی ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے اپنے مغرب کے سفر ناموں میں ان تلخ حقائق کو گہرے طنز کا نشانہ بنایا ہے ۔ ان کے نزدیک مغربی معاشرے کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ اس سماج نے صنعتی ترقی کے لیے ایسی

نعمتوں کو قربان کیا جن کے طفیل وہ اس مقام تک پہنچا تھا۔ اس کو اس تک لانے والی نعمتیں اس سماج میں غیر ضروری خیال کی جانے لگی ہیں۔ یہ سب کیا دھرا صنعتی ترقی کا ہے جس میں انسان کی اپنی سوچ اور فکر مفلوج ہو جاتی ہے اور انسان مکمل طور پر مشین کا غلام بن جاتا ہے۔ صنعت میں انسان مشین کو نہیں چلا رہا ہوتا بلکہ مشین انسان کو چلا رہی ہوتی ہیں۔ انسان مشین کے ساتھ ایک کٹھ پتلی بنا نظر آتا ہے۔ جس طرف کو مشین کی ڈیمانڈ ہو، چلانے والے کی حرکت بھی اس طرف کی ہوتی ہے۔ انسان مشین کی حرکات و سکنات کے مطابق اپنی حرکات و سکنات پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جب انسان کو فکری حوالے سے اس حد تک کمزور کر دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے حرکت بھی نہیں کر سکتا تو فکری جمود جنم لیتا ہے۔ یہی فکری جمود رشتوں کی پامالی اور بد تہذیبی کی طرف لے کر جاتا ہے۔

اولڈ پیپلز ہومز مغربی سماج کے لیے ایسے ناسور بن چکے ہیں جو اس سماج کو اخلاقی پسماندگی کی نذر کرتے جا رہے ہیں۔ جس اولاد کو والدین بوجھ لگنے لگتے ہیں وہ انہیں ان اولڈ پیپلز ہومز میں چھوڑ آتی ہیں اور چند سال گزرنے کے بعد خود بڑھاپے کو پہنچ کر وہاں پہنچ جاتے ہیں یوں یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے اولڈ پیپلز ہومز کو بھی گہرے طنز کا نشانہ بنایا ہے کہ اس رواج نے رشتوں کی اہمیت ختم کر کے رکھ دی ہے ایک جگہ اولڈ پیپلز ہومز کے ہاتھوں ہونے والی سماجی تباہی کا ذکر یوں طنزیہ انداز میں کرتے ہیں:

> "بوڑھے کی بات نہ سمجھنے کے باوجود اس کے لہجے کے درد نے اس میز کے گرد بیٹھے ہوئے بوڑھوں کے چہروں کو حزن و ملال کی تصویر بنا دیا تھا اور اس کمرے کی فضا کو ایسے ویران قبرستان میں تبدیل کر دیا تھا جہاں ہوا کی سرسراہٹوں میں روحوں کے چلنے کا گمان ہوتا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے اولڈ پیپلز ہومز میں موجود ان بوڑھوں کے مصروف بیٹوں نے کام نپٹانے کیلئے اپنے والدین کو مرنے سے قبل غسل دے دیا ہے۔ انہیں کفن پہنا دیے ہیں اور اب انہیں تجہیز و تکفین کرنے والے ادارے کے سپرد کر کے مطمئن ہو گئے ہیں۔"(۹)

یہ وہ سیاہ اندرون ہے مغربی سماج کا جس کی تقلید کے لیے مشرق کے باشندے مرے جا رہے ہیں اور بات بات پر مغرب کی ترقی کی مثالیں دیتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی نے گہرے طنز کے ذریعے مغربی سماج کی ان نا ہمواریوں کو اجاگر کیا ہے۔ یہ کہنا کہ کام کاج میں مصروف لوگ اپنے والدین سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اتنی جلدی میں ہیں کہ انھوں نے زندہ والدین کو ہی کفن پہنا کر تدفین کے اداروں کے سپرد کر رہے ہیں اس سماجی المیے کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو مغربی سماج میں روز بروز بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ صنعتی ترقی اور دولت کی ہوس نے وہاں کے خاندانی نظام کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ انسان، انسان کے لیے ترس رہا ہے لیکن مشینیں ہیں کہ انسان کو اس کی صلاحیتوں سمیت نگلی چلی جا رہی ہیں۔ وہاں اگر کچھ باقی ہے اس ہوس کے پجاری اس کی پرستش میں اس قدر آگے نکل گئے ہیں کہ بنیادی رشتوں کے ساتھ ساتھ بنیادی انسانی اور تہذیبی اقدار سے بھی عاری ہو گئے ہیں۔

ہوس اور حرص مغربی سماج میں صرف مالی طور پر کمزور طبقے میں ہی نہیں بلکہ مشرقی اشرافیہ بھی ان میں مبتلا ہے۔ لوگ پیسے کی خاطر کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ مشرقی سماج میں ہم دیکھتے ہیں کہ سڑک کے کنارے کسی شخص کو کوئی بھی کار یا موٹر سائیکل والا آسانی سے ساتھ بٹھا کر جہاں تک ممکن ہو اس کا سفر طے کروا دیتا ہے اور بدلے میں کچھ بھی نہیں لیا جاتا۔ یہ اخلاقی قدر بعض ممالک میں ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ مغربی سماج میں شرفاء لوگ بھی اپنے سفر کا پٹرول خرچ دوسروں سے پورا کرنے کے عادی ہیں۔ اس سماجی تلخ حقیقت سے اس سماج کی ابتری کا علم ہوتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے اپنے سفر ناموں میں اس سماجی المیے کو بھی بیان کیا ہے ایک جگہ بیان کرتے ہیں:

> "جب مجھے وہ واپس ہوٹل چھوڑنے کے لیے گھر سے نکلی تو ایک کار ہمارے پاس آ کر رک گئی، صاحب کار کے پوچھنے پر آمنہ نے اسے بتایا کہ ہمیں ایمپائر ہوٹل جانا ہے۔ اس مرد شریف نے کار کا دروازہ کھولا اور کہا "بفرمائید"! (تشریف رکھیئے) جب ہم ہوٹل کے قریب اترے تو آمنہ نے پرس میں سے کچھ پیسے نکال کر اسے دیئے جو اس نے یہ عجلت اپنی جیب میں ڈال لیے۔ پتا چلا کہ یہاں شرفاء پٹرول کا خرچ پورا کرنے کے لیے لوگوں کو لفٹ دیتے ہیں اور اس کا معاوضہ پورے اشراح صدر کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔"(۱۰)

یہ حرص و دولت خوب کے بعد عطاء الحق قاسمی کو تہران میں بھی نظر آئی۔ انھوں نے تہران کے سفر کے دوران کا ہی یہ واقعہ لکھا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ دور میں انسان کے نزدیک اخلاقیات سے زیادہ دولت کا چلن ہے۔ انسان دوسروں کا کوئی بھلا بھی اگر کرتا ہے تو اس کی پوری قیمت اس دنیا میں وصول کرنے کی کوشش میں ہوتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے اس سماجی المیے کو گہرے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

عطاء الحق قاسمی اپنے سفر نامے "دنیا خوبصورت ہے "ہیں۔ یورپ کی آزادی کا ہمارے یہاں کی بظاہر آزادی سے موازنہ کرتے ہیں وہ اپنے سفر نامے میں یورپ اور امریکہ کے لوگوں کو آزاد نہیں سمجھتے بلکہ وہ ان کو سرمایہ دارانہ نظام کا غلام قرار دیتے ہیں وہاں آزادی سے مراد فکری آزادی لیا جاتا ہے جو کہ وہاں انسانی حقوق کو تحفظ دینے کے لیے بنائے گئے۔ سخت قوانین کی صورت میں موجود ہے۔ وہ سمجھتے ہیں بظاہر ہم دنیا کے نقشے آزاد مملکت رکھنے کے باوجود بھی ہم آزاد نہیں۔ وہ مصنف نے یہاں گہرا طنز کرتے ہوئے اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے ہم غیروں سے آزادی کر کے آج بھی اپنے آقاؤں کے غلام ہیں۔ ایک پڑھا لکھا انسان کسی بھی معاشرے میں بھی رہے وہ سب سے زیادہ آزادی کا متقاضی ہوتا ہے جبکہ ہمیں فکری آزادی بھی حاصل نہیں ہے۔ ہم ہر وقت ایک انجانہ خوف ہمارے میں مبتلا رہتے ہیں۔ جو ہمارے سیاسی نظام اور مروجہ سماجی اقدار کے بطن سے پھوٹتا ہے۔

> "ہم آسٹریلیا کی اسٹیٹ کوئز۔ لینڈ کے دارالحکومت برسبین کے مضافات میں ہیں۔ جسے ۱۸۴۲ء قیدیوں نے تعمیر کیا۔ اب ان کی نسلیں آزاد ہیں اور ہم غلام ان سے پوچھنے آئے ہیں کہ ہماری نسلیں کب آزاد ہوں گی۔"(۱۱)

عطاء الحق قاسمی نے اپنے اسفار کے دوران دنیا کے مختلف ممالک میں رائج مختلف نظاموں کے بارے میں بڑے قریب سے جانا۔ انہوں نے مختلف نظاموں اور ان کے سماج پر گہرے اثرات کا خود مشاہدہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سفر ناموں میں سماجی عکاسی میں دنیا میں رائج مختلف نظام حکومت کے بارے میں آراء ملتی ہیں۔ انہوں نے ان نظاموں میں پائی جانے والی خرابیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے سماج پر ان کے اثرات اور سماجی ناہمواریاں پیدا کرنے میں ان نظاموں کے کردار پر بحث کی ہے۔ ان کا انداز بیان لطیف طنز لیے ہوتا ہے یہ طنزیہ انداز وہ مختلف مثالیں اور حقائق پیش کر کے اور دلچسپ بنا دیتے ہیں جس کی وجہ سے قاری کی دلچسپی تحریر میں برقرار رہتی ہے۔

استحصالی نظاموں کے ساتھ ساتھ عطاء الحق قاسمی نے سماجی طنز نگاری میں معاشرے کی جس برائی کو زیادہ سامنے لانے کی کوشش کی ہے وہ دوسروں کو دھوکا دے کر اپنا مفاد حاصل کرنا ہے۔ یہ ایسی سماجی برائی سے جس میں استحصال کرنے والا اور استحصال کا شکار ہونے والا دونوں ہی اسی سماج کے باشندے ہوتے ہیں۔ دونوں کا واسطہ اسی ایک سماج سے ہوتا ہے لیکن دونوں میں جس کو زیادہ موقع ملتا ہے دوسرے کا استحصال کر کے، اسے دھوکا دے کر اپنا مفاد حاصل کر لیتا ہے۔ اس عمل کے دوران نہ کسی کے عقیدے کا خیال رکھا جاتا ہے اور نہ ہی کسی کی عقیدت کا۔ مطمع نظر صرف اور اپنا مفاد ہوتا ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ قاسمی صاحب اپنے ایک سفر نامے میں بیان کرتے ہیں:

> "ایک طرف مذہب پر یقین نہیں ہے، دوسری طرف آپ زیارتوں کے لیے چلے آئے یہ کیا چکر ہے؟"
>
> "چکر کیا ہوتا ہے؟ یہ بڈھا بیٹھا ہے، مولانا نے بزرگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، یہ میرے ایک مرید کا باپ ہے، سارا خرچ اسی نے ادا کیا ہے۔ میں نے سوچا چلو مفت کی سیر ہو جائے گی میں کسی کلب میں چلا جاتا تھا جہاں پہلے ڈانس دیکھتا تھا اور بعد میں اس بڈھے کو اسی کلب کے گرد ایک پھیرا لگا دیتا تھا کہ لو زیارت کر لو یہ بے وقوف کلب کی دیواروں کو چومتا تھا اور اس پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔۔۔" یہ کہتے ہوئے مذہب کے نام پر انسانوں کو دھوکا دینے والے اس شیطان نما انسان نے ہنسنا شروع کر دیا۔ اس کی ہنسی میں، میں نے بھی اپنی ہنسی شامل کر دی اور ان لمحوں میں، میں نے خود کو اس راسپوٹین کا بغل بچہ محسوس کیا۔"(۱۲)

مذہب کے لیواؤں کی طرف سے دیے گئے ایسے دھوکے نہ صرف سماج کو ابتری کی جانب لے جاتے ہیں بلکہ مذہبی اور حقیقی مذہبی رہنماؤں پر سے بھی عوام کے اعتماد کو ختم کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سماج میں رشد و ہدایت کے سر چشموں سے عوام دور ہوتی جا رہی ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے غیر جانب داری کا مظاہرہ

کرتے ہوئے اس سماجی برائی کو طنز کا نشانہ بنایا ہے جس میں ان کے اپنے ہم وطن ملوث ہیں اور ہم وطنوں میں سے بھی وہ طبقہ جس نے خود پر ملائیت اور مذہب کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ ایسے ملائیت کا لبادہ اوڑھے لوگوں نے عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے سب ڈھونگ رچا رکھے ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جہاں انہیں اپنے مقاصد کی تکمیل ہوتی نظر آتی ہے وہاں وہ فوراً اپنی اصلیت بھی ظاہر کرنے سے نہیں چوکتے۔ ایسے ہی املا سے مکالمے کو بیان کرتے ہوئے قاسمی لکھتے ہیں:

"میں نے بھی مولانا کے ہاتھ کو گرم جوشی سے ہلاتے ہوئے کہا۔

"حضرت! آپ نے تو داڑھی سے مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ میں تو تھوڑی دیر بعد آپ سے اجازت طلب کرنے والا تھا مگر۔۔۔۔۔۔۔"

"پیارے یہ داڑھی واڑھی تو سب فراڈ ہے صرف لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے ورنہ میں تو سرے سے مذہب پر یقین ہی نہیں رکھتا۔"(۱۳)

اس طرح کے کئی ملا ہمیں اپنے سماج میں بھی نظر آتے ہیں جن کی زندگی میں مذہبی تعلیمات کا کوئی عمل دخل نظر نہیں آتا انہوں نے لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے مذہب اور شریعت کے لبادے اوڑھ رکھے ہیں اور خود ساختہ مذہبی پیشوا بنے بیٹھے ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو سفر نامہ نگاری میں عطاء الحق قاسمی نے سماجی طنز نگار ہونے کا بہترین ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے دنیا کے مختلف سماجوں میں پھیلی برائیوں اور ناہمواریوں کو طنز کا نشانہ بناتے ہوئے قارئین کو ان معاشروں کی حقیقی تصویر دکھائی ہے۔

عطاء الحق قاسمی کی سفر نامہ نگاری کا ان کے معاصر سفر نامہ نگاروں کے ساتھ تقابل کرتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ قاسمی کے ہاں چیزوں اور حالات کو بیان کرنے کا انداز اپنے معاصر سفر نامہ نگاروں سے خاصا مختلف ہے۔ ان کا مشاہدہ کرنا اور مشاہدے کے دوران سامنے آنے والی ناہمواریوں پر طنز کرنا انہیں ایسی

انفرادیت عطا کرتا ہے جو انہیں معاصر سفر نامہ نگاروں کی صنف میں اہم مقام عطا کرتی ہے۔ اس فصل میں ہم عطاء الحق قاسمی کی سفر نامہ نگاری کا ان کے دو معاصر اہم سفر نامی نگاروں مستنصر حسین تارڑ اور جمیل الدین عالی کی سفر نامہ نگاری کے ساتھ تقابل کریں گے اور یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ ان سفر نامہ نگاروں میں عطاء الحق قاسمی کس طرح اپنی انفرادیت قائم کرتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ

مستنصر حسین تارڑ کا بنیادی حوالہ سفر نامہ نگاری ہے۔ انہوں نے بے شمار اسفار کیے جن میں اندرون و بیرون ممالک کے اسفار شامل ہیں۔ ان اسفار کو انہوں نے سفر ناموں کی صورت میں قارئین کے سامنے پیش کیا۔ سفر نامہ نگاری کے حوالے سے اس باب کی حدود کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے دو سفر ناموں کا انتخاب کیا گیا ہے جن میں "نکلے تیری تلاش میں" اور "اندلس میں اجنبی" شامل ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کا معروف سفر نامہ "نکلے تیری تلاش میں" ۱۹۷۱ء میں منظر عام پر آیا۔ اس سفر نامے کو بے حد پذیرائی ملی اور یہیں سے جدید سفر نامے کا آغاز ہے۔ اسی لیے تارڑ صاحب کو جدید سفر نامے کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے جو سفر نامے لکھے ان کی ایک لمبی فہرست ہے۔ جن میں سے چند ایک کو انعام بھی مل چکا ہے۔ ان کے سفر ناموں میں تاریخ، فلسفہ، جغرافیہ، تاریخ تہذیب ماضی پرستی، نرگسیت، شگفتہ اسلوب، افسانوی طرزِ نگارش، طنز و مزاح کا پہلو، رومانویت، فکر و عمل کی چاشنی اور ذاتی تجربات و جذبات کی خوب صورت رنگ آمیزی نے ان کے فن کو درجہ کمال تک پہنچا دیا ہے۔ ان کی سفر نامہ نگاری کے بارے میں انور سجاد لکھتے ہیں:

> "مستنصر حسین تارڑ کو اداسی اور کسک کا تمغہ ضرور ملتا ہے جو وہ چپ چاپ ہمیں تھما دیتے ہیں۔ موقع محل کی مناسبت سے مستنصر حسین تارڑ ان علاقوں کی تاریخ کا تڑکا بھی ساتھ ساتھ اس مہارت سے لگاتا ہے کہ پتا نہیں چلنے دیتا کہ جغرافیے کے ساتھ ساتھ تاریخ کا درس بھی دے رہا ہو۔ اور یوں تاریخ اور جغرافیے کے آپس کے جائز اور ناجائز تعلق کو بھی ایکسپوز کر دیتا ہے۔ حال ناگفتہ ہو یا شگفتہ مستنصر کی حس مزاح کہیں ساتھ نہیں چھوڑتی۔" (۱۴)

مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں میں اقوام عالم کی تاریخ کے بیان کے ساتھ ان اقوام کے ایسے رویوں کی عکاسی بھی طنزیہ انداز میں کی گئی ہے جن کی وجہ سے وہ اقوام تباہی کے دہانے پر پہنچی۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ترقی کی دوڑ میں آگے نکل جانے والی اقوام کی ترقی کے راز بھی سفر نامہ نگاری کے ذریعے اپنے قارئین پر افشاں کیے ہیں یوں ان کی سفر نامہ نگاری کی صورت میں مختلف زمانوں کی مختلف اقوام کی تاریخ ایسے سامنے آتی ہے کہ سماج کی ارتقائی صورت حال سے آگاہی ہونے لگتی ہے۔

جدید سفر نامہ نگاری میں مستنصر حسین تارڑ کو امام کی حیثیت حاصل ہے۔ انہوں نے سفر نامہ نگاری کو نئی جہتوں سے آشنا کیا اور اس میں ایسی تکنیکیں استعمال کی ہیں جو ان سے پہلے استعمال نہیں کی گئی تھیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے سفر نامے اردو ادب میں خاص انفرادیت لیے ہوئے ہیں۔ انہوں نے سفر نامے لکھنے کا ایسا انداز اپنا یا جس کی اقتدار میں کئی سفر نامے لکھے گئے۔ انہوں نے سفر نامے کو دلچسپ، پر مزاح، آسان اور سلیس تحریر سے اوج کمال تک پہنچایا۔ ان کے سفر نامے پڑھ کر کئی لوگ آوارہ گرد بن کر ان مقامات کو دیکھنے کو نکل پڑتے ہیں۔ سفر نامہ نگاری میں نہ صرف انہوں نے سوچ اور فکر کے نئے انداز پیش کیے ہیں بلکہ انہوں نے جو نثر استعمال کی ہے وہ بھی خاصے کی چیز ہے۔ ان کی نثر کے بارے میں سلمان باسط لکھتے ہیں:

> "تارڑ کو شاعری پر ترجیح دیتے ہیں اور اسے زیادہ مشکل تخلیقی کام قرار دیتے ہیں وہ محفلوں اور ملاقاتوں میں اردو بولنے سے اجتناب کرتے ہیں اور پنجابی بولنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی طنزیہ و مزاحیہ حس بہت تیز ہے۔ اس کا اندازہ ان کی تحریروں کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ محبت، جنس اور موت کو اپنی نگارشات کا موضوع بنانے میں انکا شخصی کردار پنہاں ہے۔"(۱۵)

سفر نامہ نگاری میں مستنصر حسین تارڑ ایک سفر نامہ نگار کے طور پر بہت بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کی تحریریں مثالی تحریریں ہیں اور ان کی تحریر سے خاص و عام لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ لکھنے کا ایسا انداز کہ لفظ خود بولتے ہیں۔

اپنی تحریروں میں وہ اپنی ظاہری شخصیت کو اکثر طنز کا نشانہ بناتے رہتے ہیں، جس میں بچپن سے لے کر موجودہ شکل وشباہت تک بیشمار واقعات ملتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کی سفر نامہ نگاری کو دیکھا جائے تو یہاں بھی وہ طنز سے خوب کام لیتے نظر آتے ہیں۔ یہ بات حقیقت ہے کہ ادب کی کوئی بھی صنف ہو وہ تخلیق کار کی شخصیت کو مکمل طور پر نظر انداز نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر تحریروں میں سوانحی عناصر کسی نہ کسی حد تک موجود ہوتے اور تحریر تخلیق کار کی شخصیت کا پرتو نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ تحریر اور خاص طور پر سفر نامے میں اس تہذیب اور ثقافت کی عکاسی بھی لازمی ہوتی ہے جہاں کا سفر نامہ لکھا جارہا ہوتا ہے۔ اس بارے میں ایک اہم بات یہ بھی کہ آپ کسی جگہ کو اپنائے بغیر اور کسی تہذیب کو سمجھے بغیر اس کے بارے میں نہیں لکھ سکتے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو جگہوں کو اپنانے اور تہذیبوں کو سمجھنے میں مستنصر حسین تارڑ کو خاص ملکہ حاصل ہے جس کی وجہ سے ان کے سفر ناموں میں ان کی ذاتی زندگی کے تجربات ومشاہدات جھلکتے نظر آتے ہیں۔

سماج میں پھیلی مختلف برائیوں، کوتاہیوں اور ناہمواریوں کو بیان کرنے کے لیے سفر نامہ نگار عام طور پر طنز کا سہارا لیتے ہیں۔ طنز میں وہ قاری کی توجہ سماج کے اس پہلو پر مبذول کرواتے ہیں جو عام لوگوں کے سامنے ہونے کے باوجود ان کی نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان روز اس سماجی ناہمواری کا مشاہدہ کرتا ہے لیکن عادت بن جانے کی وجہ سے اس طرف توجہ کم ہوتی ہے۔ ایسی ہی ایک سماجی برائی وقت کی پابندی نہ کرنا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سماج میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جن کے نزدیک وقت کی پابندی کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ سفر پہ نکلنا ہو یا کسی تقریب میں شرکت کے لیے جانا ہو گھنٹا دو گھنٹے کی دیر تو عام معمول کی بات ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے "نکلے تیری تلاش میں" میں بھی اس سماجی برائی کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ وہ سفر کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "بس کا وقتِ روانگی تین بجے تھا، لہٰذا پورے چھ بجے چلی اور سیدھی باسفورس میں ٹھہرے ہوئے سٹیمر میں گھس گئی۔"(۱۶)

یوں انہوں نے ایک سماجی برائی کو موضوع بنا کر طنز کا نشانہ بنایا ہے جو ہمارے سماج میں عام ہونے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی عادت بن چکی ہے۔ اگر کسی تقریب میں کوئی شخص وقت کی پابندی کرتے ہوئے وقت پر پہنچ جائے تو اسے تقریب کے آغاز کے لیے گھنٹوں انتظار کی کوفت اٹھانی پڑتی ہے۔ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی وقت پر تقریب کا آغاز کرنے کے لیے اس سے کچھ پہلے کا وقت دیا جاتا ہے تاکہ اصل وقت سارے لوگ جمع ہو جائیں ایسی صورت حال میں بھی وقت پہ آنے والے انتظار میں پڑے رہتے ہیں۔ یوں تارڑ صاحب نے وقت کی پابندی نہ کرنے پر لطیف انداز میں طنز کرتے ہوئے کہ تین بجے کا وقت تھا اس لیے چھ بجے چلی کہاں ہے۔ یہاں "اس لیے" اس سماج کے منہ پر چماٹا ہے جو مہذب کہلانے کے باوجود وقت کی پابندی سے بے بہرہ ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے سماج میں پھیلی ہوئی مختلف ناہمواریوں کو اپنے سفر ناموں میں طنزیہ انداز میں بیان کرتے ہوئے اس سماج کو لازمی مد نظر رکھا ہے جس سماج میں وہ ناہمواری یا برائی پائی جاتی ہے۔ ہر سماج کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں جن کو مد نظر رکھ کر اس سماج کو دیکھا جاتا ہے۔ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ ایک کام ایک سماج میں اچھا نہ سمجھا جاتا ہو لیکن وہ کام کسی دوسرے سماج میں ان کی تہذیب اور ثقافت بن چکا ہو۔ اس کی ایک مثال ہم لباس ہی سے لیتے ہیں۔ مغربی طرز کے بہت سے لباس ایسے ہیں جنہیں مشرق میں فحاشی اور عریانی کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے لیکن مغرب میں وہی لباس ان کے سماج کا حصہ ہے۔ مغرب کا کوئی نقاد یا دانشور اس لباس کے خلاف نہیں لکھے گا، جبکہ مشرق والوں کے نزدیک ایسا لباس قابل اعتراض قرار پاتا ہے۔ یہاں ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ بعض بنیادی اقدار انسانی اقدار ایسی ہیں جن پر دنیا کے کسی بھی خطے میں سمجھوتا نہیں کیا جاتا۔ انسان خواہ کسی بھی مذہب یا تہذیب سے تعلق رکھتا ہو وہ بہر حال انسان ہے۔ انسان ہونے کے ناتے انسان اقدار کے خلاف چلنا اس کے لیے درست نہیں اس لیے انسانی اقدار کی خلاف ورزی کسی بھی انسان کو سماج میں اپنے ارفع مقام سے گرا دیتی ہے۔ مشرق ہو یا مغرب ہر انسان کے لیے انسانی اقدار اور انسانی عظمت کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے "نکلے تیری تلاش میں" میں انہوں نے سماج کی ان بہت سی ناہمواریوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے جو انسانی اقدار کے خلاف ہیں۔ انسان نے جب سے دنیاوی ترقی کی راہ پر قدم رکھا ہے اور

آئے روز نئی سے نئی ایجادات میں بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے وہ انسانوں سے غافل ہو تا جا رہا ہے۔ انسان کی یہ ترقی اسے انسانوں کے تو شاید قریب لا رہی ہو لیکن انسانیت سے دور لیے جا رہی ہے آج کا انسان یوں تو مریخ تک رسائی حاصل کرنے کے جتن کر چکا ہے۔ وہ دنیا کو تسخیر کرنے کے ارادے سے کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہے لیکن انسانیت کے حوالے سے دیکھا جائے تو اسے اپنے آس پاس کے انسانوں کی بھی خبر نہیں کہ اس کے پڑوس کے انسان کے حالات کیا ہیں۔ اس تلخ سماجی المیے کو تارڑ یوں بیان کرتے ہیں:

> "مرد کے چہرے پر ریت کے ذرے اور پسینے کے قطرے جُھریوں کو بھر رہے تھے۔ میں اسے کہتا تھا: "بیٹا تم میں بڑا بننے کی خواہش نہیں ہے۔ تم ایک اچھی کتاب پڑھ لیتے ہو تو سمجھتے ہو کہ کوئی دنیا مل گئی۔ تمہاری آنکھیں افق کے اسپار دیکھتی ہیں مگر تمہیں اپنے گردو پیش کی خبر نہیں۔ پڑھنا لکھنا اور صرف آوارہ گردی تو کوئی بات نہ ہوئی۔"(۱۷)

یہ ہمارے سماج کی ایک تلخ حقیقت ہے۔ اس حقیقت کا ادراک کرنے کی ضرورت ہے کہ تعلیم انسان کو انسانی اقدار سکھاتی ہے۔ اسے انسان بناتی ہے اور دوسرے انسانوں کا دکھ درد محسوس کرنے کا طریقہ سکھاتی ہے۔ اگر انسان محض کتابوں کی ورق گردانی کو ہی تعلیم سمجھ لے تو یہ اس کے لیے ہی نہیں بلکہ سماج کے لیے بھی نقصان دہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ترقی کی راہوں پر گامزن ہونے کے دعویٰ کرنے والے اور افق سے پار تک دیکھنے والے اپنے آس پاس بسنے والے انسانوں سے بے خبر ہیں۔ ان کی یہ بے خبری ان کی تعلیم اور دنیا کی تسخیر پر سوالیہ نشان لگاتی ہے۔ تارڑ نے اس سماجی المیے کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

سماجی ناہمواریوں کے حوالے سے دیکھا جائے تو مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے "نکلے تیری تلاش میں" میں انہوں نے بعض اقوام کے خاص رویوں کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ سماج میں ان اقوام کے ان باشندوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے جو اس منفی رویے کے حامل ہوتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ان کے اس سفر نامے میں پنجاب کے ان باشندوں کے حوالے سے ملتی ہے کولہو کے بیل کی طرح ساری عمر ایک ہی چکر میں چلتے رہے ہیں اور اس بات سے بے خبر رہتے ہیں کہ دنیا میں جدت آ رہی ہے۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں پنجاب کے دیہاتوں خاص طور پر ڈیروں جہاں اصل پنجابی ثقافت اور تہذیب نظر آتی ہے وہاں کے باشندوں کا طرز زندگی اسی پرانی ڈگر پر

چلا جارہا ہے جو انہیں اپنے آباؤ اجداد سے وراثت میں ملا تھا۔ جدید ترقی پذیر دور میں ان علاقوں میں تعلم اور صحت کی سہولیات ہونے کے باوجود وہاں تعلیمی حالت پسماندہ ہے جس کی بڑی وجہ وہاں کے لوگوں کی سوچ ہے جس میں تعلیم اور جدید رجحانات کے لیے کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ لوگ اپنے شب و روز ایک ہی ڈگر میں بسر کیے جارہے ہیں۔ اگر کوئی ایک آدھ ان میں سے آگے نکل بھی جاتا ہے تو جلد یا بدیر ان سے الگ ہو کر شہر کو اپنا مسکن بنالیتا ہے یوں وہ لوگ اپنے انداز میں ایک ہی چکر میں چلے جاتے ہیں اوران کی زندگیاں اسی میں بسر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے پنجاب کے بعض لوگوں کے اس رویے کو بیان کرنے کے لیے اپنی مثال پیش کرتے ہوئے اس رویے کو یوں طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

> ”زندگی جامد ہو کر رہ گئی تھی اور مجھے شدت سے اپنے گلے میں ”پنجالی“ اور آنکھوں پر چڑھے کھوپوں“ کا احساس ہونے لگا۔ میں ایک جگہ چکر کاٹ رہا تھا۔ میرا جی چاہا کہ رسہ تڑوا کر بھاگ نکلوں۔“ (۱۸)

سماجی طنز کے حوالے سے مستنصر حسین تارڑ کے ہاں ایک اور اہم رویہ جو ملتا ہے وہ سماج میں پائے جانے والے خود ساختہ نظریات ہیں۔ ان میں سے بعض نظریات ایسے بھی ہیں جن کے بارے میں واضح ہدایات موجود ہیں لیکن سماجی باشندوں نے ان ہدایات کو غلط معنوں میں لے کر اپنی مرضی کے مطالب اخذ کر رکھے ہیں اور انہی پر عمل کیے جارہے ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں جن کو سمجھ بوجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود ایسا رویہ اپنائے ہوتے ہیں جو کسی طرح بھی سود مند نہیں ہے۔ اس کی ایک مثال تارڑ کے اس سفر نامے میں بھی بیان ہوئی ہے کہ پانی جس کے صاف اور پاک ہونے کے بارے میں اسلام میں واضح ہدایت اور نشانیاں موجود ہیں لیکن لوگوں نے ایک طنزیہ لیا ہے کہ ”بہتا پانی ہمیشہ پاک ہوتا ہے“۔

> ”مسجد کے سامنے والے پل کے پہلو میں بنی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے اتر جایئے تو دریا کی ہمہ گیر افادیت عیاں ہو جائے گی۔ ایک طرف لمبے رشتوں کی مدد سے ازبک قالینوں کو دھویا جارہا ہے، ساتھ ہی ایک خان صاحب وضو کر رہے ہیں، کالے چغے میں ملبوس ایک خانہ بدوش لڑکی ٹین کے کنستر میں گھریلو استعمال کے لیے پانی بھر رہی ہے۔ اس سے ذرا پرے چند گردوپیش سے بے خبر اسے ”فلش سسٹم“ کے اصول کے تحت استعمال کر رہے ہیں۔ بہتا پانی ہمیشہ پاک رہتا ہے۔“ (۱۹)

یہ اور اس طرح کے اور بہت سے طرز عمل ایسے ہیں جو سماج کے باشندوں نے کم عقلی کی بنا پر اپنی زندگی کا حصہ بنا لیے ہیں۔ وہ محض لفظوں پر یقین کرتے ہوئے عمل کیے جا رہے ہیں اور اپنی سوچ اور تدبر سے کام نہیں لیتے جس کی وجہ سے سماج میں بیگاڑ پیدا ہوتا ہے اور سماج میں بہتری آنے کی بجائے تنزلی کے اشارے ملنے لگتے ہیں۔ تارڑ نے ان سماجی رویوں کو خاص طور پر طنز کا نشانہ بنایا ہے کہ لوگ اس حد تک عقل و دانش سے بے بہرہ ہوتے جا رہے ہیں کہ سامنے دیکھتے ہوئے بھی اس پانی میں قالین دھوئے جا رہے ہیں جن پر لگی گندگی اسی پانی کا حصہ بن رہی ہے۔ اس پانی کو گھریلو استعمال کے لیے بھی لیے جا رہے ہیں اور دیگر استعمالات میں بھی لا رہے ہیں اور ان کے پاس دلیل صرف یہ ہے کہ بہتا پانی ہمیشہ پاک ہوتا ہے۔ یہ اور اس طرح کے دیگر بہت سے سماجی طرز عمل ایسے ہیں جنہیں مستنصر حسین تارڑ نے اپنے سفر نامے میں طنز کا نشانہ بنایا ہے اور سماج میں پھیلی ان ناہمواریوں کو بیان کر کے اس سوچ کو بدلنے کی کوشش کی ہے جو سماج کی بہتری کی بجائے ابتری کی طرف لیے جا رہی ہے۔

مغرب کی نقالی مشرق کے بہت سے سماجوں کی ایک اور روایت بن چکی ہے۔ مغرب کی دیکھا دیکھی بہت سے مشرقی سماجوں کے لوگ اپنی تہذیب و ثقافت سے روگردانی اختیار کرتے جا رہے ہیں، مغربی لباس کے ساتھ ساتھ اپنے طرز زندگی میں بھی مغربیت لانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اس عمل کو جدت اور ترقی سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ حقیقت میں یہ ترقی ہر گز نہیں، کیونکہ ترقی اپنے اسلاف کی روایات اور اپنی تہذیبی و ثقافتی اقدار کو پامال کرنے کا نام نہیں ہے۔ ایشیائی ممالک میں انگریزوں کے کئی سالوں کے تسلط نے انہیں انگریزی تہذیب کے قریب کر دیا۔ انگریز نے ان ممالک پر قبضے کے دوران صرف ان کے وسائل ہی کو نہیں لوٹا ان کو اپنی روایات اور اپنی تہذیب سے دور کرنے میں بھی پورا زور لگا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے لوگوں کے نزدیک اپنے اسلاف کی روایات اور ان کے طرز زندگی فرسودہ قرار پانے لگے اور وہ انگریزی کلچر اور انگریزی سماجی روایات کی چکا چوند میں بہکتے چلے گئے۔ ایسا ہی افغانستان کے کلچر کے ساتھ ہوا۔ مستنصر حسین تارڑ افغانستان کے کلچر کے حوالے سے افغان اسلاف اور موجودہ افغان نسل کے ملبوسات اور طرز زندگی کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شاہ امان اللہ کی ملکہ نے اپنی چادر اتار دی تو شاہ کو سلطنت سے ہاتھ دھونا پڑے مگر وہ پرانے وقتوں کی بات ہے۔ اب آپ کو ہر جگہ منی سکرٹ اور اونچی ایڑھی کے جوتوں میں ملبوس خواتین نظر آئیں گی۔ چادر سکڑ کر جدید وضع کے کٹے ہوئے بالوں پر "سکارف" کی شکل میں رونما ہے۔ اگر کوئی خاتون ذرا پرانی وضع کی ہے تو پھر سکرٹ اور بلاؤذر کو شٹل کاک نما سفید برقعے سے ڈھانپ لیا جاتا ہے لیکن اس طرح کہ چلتے وقت عریاں پنڈلیوں اور ٹانگوں کی دعوتِ نظارہ عام ہو جائے۔ روایتی لباس پہننے والوں کی تعداد دن بدن کم ہوتی جارہی ہے۔ مجھے ذاتی طور پر نئی روشنی کے تحت جدید اصطلاحات سے پرخاش نہیں لیکن یہ اصطلاحات زندگی کے ایسے شعبوں سے متعلق ہونی چاہئیں جہاں مثبت نتائج بر آمد ہو سکیں۔ اپنے روایتی لباس کو خیر باد کر کے مغربی ٹکڑے زیب تن کر لینا احساس کمتری کی علامت ہے، ترقی کی نہیں۔"(۲۰)

ایشیائی سماج کا یہ بہت بڑا مسئلہ ہے کہ انگریزوں کے زیر تسلط رہنے کی وجہ سے اس سماج کی تہذیب و ثقافت ابھی تک انگریزی تہذیب و ثقافت کے تسلط سے باہر نہیں نکل سکی۔ تارڑ کے اس سفر نامے میں ایشیائی ممالک کے سماج کے ایسے منفی رویوں پر طنز ملتا ہے۔ انہوں نے موازنے کا سا انداز اپناتے ہوئے انگریزی تہذیب کو ترقی کی علامت سمجھنے والوں کو اپنے اسلاف کی روایات سے بھی آشنا کرنے کا فریضہ سر انجام دیا ہے۔ یوں ان کا طنز سماج پر تنقید سے زیادہ اصلاح کا حامل ہے۔ ان کا سماجی طنز ان کے گہرے سماجی شعور پر دلالت کرتا ہے۔ ان کے نزدیک انسان کی اصل ترقی وہی ہے جو وہ اپنی تہذیب اور ثقافت میں رہتے ہوئے کرتا ہے۔ اگر انسان ترقی کے نام پر اپنی تہذیب اور ثقافت سے بے بہرہ ہو جائے تو وہ ترقی نہیں بلکہ احساس کمتری کے مترادف ہوتی ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کے ایک اور معروف سفر نامے "اندلس میں اجنبی" میں بھی سماجی طنز کا اظہار ملتا ہے۔ انہوں نے یہ سفر نامہ اندلس کی سرزمین کا کیا تھا۔ اس سفر نامہ میں انہوں نے سماج اور ثقافت کی عکاسی کے ساتھ ساتھ اس سماج میں پائی جانے والی ناہمواریوں کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے جن کی وجہ سے سماج زوال پذیر ہوتے ہیں۔ انہوں نے سفر نامے میں ہسپانیہ کے لوگوں خاص طور پر امن و امان قائم رکھنے والے اداروں کے اہلکاروں کو

طنز کا نشانہ بناتے ہوئے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہوس اور جنسی جبلت خواہ وہ کسی بھی صورت میں ہو ان اہلکاروں کی سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہیں۔ یہی کمزوری انہیں اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی بھی درست طریقے سے نہیں کرنے دیتی۔ ایک ایسا ہی واقعہ تارڑ یوں بیان کرتے ہیں:

> "میں فرانس سے ہسپانیہ میں داخل ہونے والے سیاحوں کی ایک اور طویل قطار میں اپنے سامان کا تھیلا کندھے پر ڈالے پلیٹ فارم پر کھڑا جمائیاں لے رہا تھا۔ میری باری آئی تو کسٹم آفیسر نے سامان کھولنے کو کہا۔ میں نے اپنے تھیلے کی گرہ کھول کر اسے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ کسٹم آفیسر نے تھیلے میں رکھی کتابوں پر ایک نظر ڈالی "مورزان سپین" ہوں!" مورش سپین۔ نو! الحمرا کی کہانیاں۔ اس نے باقاعدہ منہ بنالیا اور میرے پاسپورٹ پر مہر لگا کر مجھے فارغ کر دیا۔ میرے پیچھے دو امریکی لڑکیاں کھڑی تھیں جنہیں کسٹم آفیسر نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سامان کی تلاشی تو درکنار اس نے ان کے پاسپورٹوں پر مہر لگانے کے بعد ان کو سلیوٹ بھی کیا۔۔ لڑکیاں خوش شکل تھیں اور ہسپانوی چاہے زندگی کے کسی شعبے سے متعلق ہو قدرتی طور پر حسن پرست ہوتا ہے۔" (۲۱)

قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکاروں کی یہی غفلت اور بے راہ روی سماج کو ایسے نقصانات سے دوچار کر دیتی ہے جن کا ازالہ ناممکن ہوتا ہے۔ یہ لوگ اپنی حرص اور ہوس کی خاطر ملکی اور عالمی امن کو بھی خطرے میں ڈال دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تخریب کار گروہوں کو اپنی کاروائیاں کرنے کے مواقع مل جاتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے ایسے لوگوں کو دھیمے طنز کا نشانہ بنا کر اس طرف توجہ دلائی ہے۔

فحاشی اور عریانی ایسے موضوعات ہیں جن پر ہر سماجی طنز نگار کے ہاں خامہ فرسائی ملتی ہے۔ خاص طور پر وہ سفر نامے جو ایشیا سے باہر کی سرزمینوں کے لکھے گئے ہیں ان میں یہ موضوع زیادہ اہم ہو کر ابھرا ہے۔ کرنل محمد خان کی کتاب "بسلامت روی" ہو یا عطاء الحق قاسمی کا سفر نامہ "گوروں کے دیس میں" سب میں اس موضوع پر خوب لکھا گیا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مشرق میں سماجی اقدار اس حد تک نہیں گر چکی کہ عورتیں اپنا جسم

محض دو ٹکڑوں سے مخصوص اعضا چھپا کر باہر نکل پڑیں اور ساحلوں پہ دعوت نظارہ دیتی پھریں ان کی مشرقی تہذیب اس بات کی اجازت دیتی ہے لیکن مغرب اس حوالے سے تمام اقدار کو بالائے طاق رکھے ہوئے ہے۔ مغرب میں دو ٹکڑوں سے مخصوص اعضا کو ڈھانپے عورتیں نہانے کے نام پر جو فحاشی و عریانی پھیلا رہی ہوتی ہیں وہ اقدار سے بے بہرہ ہونے کا ثبوت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق کا کوئی بھی سیاح جب ایسے ممالک میں جاتا ہے تو اسے ایسی عادات اور روایات اپنے ذہنی میلانات سے الٹ دکھائی دیتی ہیں۔ اس کا ذہن اس سماج کے اس رویے کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ مغرب والوں کے نزدیک شاید یہ عمل درخور اعتنانہ ہو لیکن ایک مشرقی سیاح کے لیے یہ انسانیت خاص طور پر صنف نازک کی تذلیل کے سوا کچھ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب سماج کی عکاسی کرتے ہوئے سماجی ناہمواریوں پر طنز کی طرف آتا ہے تو یہ اخلاقی بدحالی بھی بچ نہیں سکتی اور وہ اس سماجی برائی کو خوب طنز کا نشانہ بناتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے "اندلس میں اجنبی" میں بھی کئی جگہ پر اس غلط سماجی رجحان پر طنز ملتا ہے۔ انہوں نے اپنے اسفار کے دوران اس سماج کو انتہائی قریب سے دیکھا اور اسی سماج کے باشندوں کے ہاتھوں اس سماج کی اقدار کی پامالی کا خود مشاہدہ کیا تھا یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر میں اصلیت اور ان کا تجربہ سامنے آتا ہے اور ان کی تحریر قاری کو حقائق کے قریب تر لے جاتی ہے۔ انہوں نے دوسروں کی دیکھا دیکھی ہسپانیہ کے سماج میں پھیلنے والی اس سماجی برائی کو خوب طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کے اس سفر نامے میں اس سماجی برائی کو ایسے منظر نامے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ برائی کے کسی ایک چند خاص طبقوں تک محدود نہیں بلکہ ایک اجتماعی سماجی روش بن چکی ہے اور اس سماجی روش میں آنے والی نسل کی ہر لڑکی بہتی چلی جا رہی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے "اندلس میں اجنبی" میں اس بارے میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "خوش شکل ہسپانوی لڑکوں کی ٹولیاں "شکار" کی تلاش میں ادھر اُدھر گھوم رہی تھیں اور شکار وہ فرانسیسی لڑکیاں تھیں جو نہانے کا مختصر لباس بکینی زیب تن کیے ریت پر لیٹی اپنے متناسب جسم سنولا رہی تھیں۔ بکینی چارہ گر کپڑے کے ان دو ٹکڑوں کا نام ہے جو ستر پوشی کے اصول، وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے، پر عمل پیرا ہوتے ہوئے جسم کے

ایک حصے میں اور دوسرے پر اٹکا لیے جاتے ہیں۔ بکینی کے بالائی حصے کی پتلی ڈوری کی گرہ شاید صرف قوت ارادی کی بناپر قائم تھی ورنہ اس میں سوت کی مضبوطی کا چنداں دخل نہ تھا۔ چند برس بیشتر مذہبی وجوہات کی بنا ہسپانیہ کے ساحلوں پر اس قسم کا لباس پہننے پر کڑی پابندی عاید تھی۔۔۔۔۔۔اس پابندی کا یہ اثر ہوا کہ آزاد منش سیاح خواتین نے اپنے جسم کا زیادہ تر حصہ سنولانے کی خاطر ہسپانیہ کی بجائے اطالیہ اور یونان کے ساحلی مقامات کی جانب کوچ کرنا شروع کر دیا۔ ان ہر دو ممالک میں لباس پر ایسی کوئی پابندی عاید نہ تھی بلکہ وہاں کے نوجوان لباس اور زیب تن کے درمیان زیب کی غیر موجودگی کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ چنانچہ مالی مصلحتوں نے مذہبی جذبات پر غلبہ پایا اور حکومتِ ہسپانیہ نے یہ پابندی اٹھالی۔ اب غیر ملکی لڑکیاں صرف دو ڈوریاں نیچے اوپر لٹکا کر کھلے بندوں ساحل پر دھوپ سینکتی ہیں اور ان ڈھکی لڑکیوں کو دیکھ کر ہسپانوی نوجوان اپنی آنکھیں گرماتے ہیں۔"(۲۲)

اس طویل اقتباس کو دیکھا جائے بظاہر اس میں عریانی اور فحاشی کو بیان کیا جارہا ہے لیکن مستنصر حسین تارڑ نے جو انداز اختیار کیا ہے وہ گہرے سماجی طنز کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے یہاں ہسپانیہ کے ساحلوں پہ ایسے عریاں لباس پر لگنے والی پابندی کے بعد سیاح خواتین کے یہاں سے کوچ کر کے اطالیہ اور یونان کے ساحلوں پر جانے کی وجہ سے سیاحت کے شعبے میں آنے والی کمی کو نمایاں کرتے ہوئے ایسا طنزیہ انداز اختیار کیا ہے جس سے ایک طرف سیاحت کے شعبے میں آنے والی کمی کی طرف اشارہ ملتا ہے تو دوسری طرف یہ کہہ کر کہ "مالی مصلحتوں نے مذہبی جذبات پر غلبہ پایا" انہوں نے وہاں کے ارباب اختیار و اقتدار اور اس سماج کی مجموعی بدحالی اور اپنی روایات سے رُوگردانی کو واضح طنز کا نشانہ بنایا ہے کہ انہوں نے محض مالی مصلحتوں کی خاطر یہ پابندی اٹھالی اور اب ان کے نوجوان اپنی راہ سے بھٹک چکے ہیں اور جب یہ صورت حال برقرار رہی تو غیر ملکی لڑکیوں کی دیکھا دیکھی خود ان کے اپنے سماج کی خواتین اور لڑکیاں بھی اس جہنم میں کود پڑیں گی۔ یوں تارڑ نے اس سماج کی اس ناہمواری اور منفی رویے کو طنز کے ذریعے بے نقاب کیا ہے کہ محض چند ٹکوں کی خاطر وہ اپنی آنے والی نسلوں کو فحاشی اور عریانی کے سیلاب کی نذر کر رہے ہیں۔

سماج کی ایک اور منفی روش ایسی ہے جو مشرق و مغرب ہر جگہ عام ہوتی جارہی ہے۔ لوگ بڑی بے نیازی سے اس دوغلے پن اور دھوکا دہی کا شکار ہوتے جارہے ہیں۔ وہ روش ہے تصویر سازی کے حوالے سے۔ تصویر سازی ایک تو یوں بھی کوئی قابل تعریف سرگرمی نہیں اس ہر مستزاد دھوکا دہی کی تصویریں ہیں۔ دھوکا دہی اس حوالے سے کہ فوٹو گرافر کسی کپڑے یا پینا فلیکس پر تاریخی مقامات کی تصویریں بنا کر ان کے سامنے کسی کو کھڑا کر کے تصویر بناتے ہیں اور پس منظر میں وہ کپڑا یا پینا فلیکس اس تاریخی عمارت کا منظر پیش کر رہا ہوتا ہے جس کی تصویر اس پر موجود ہوتی ہے یوں تصویر سامنے آنے پر یوں معلوم ہوتا ہے کہ جس کی تصویر ہے اس نے اس تاریخی عمارت کی سیاحت کی ہے اور وہاں تصویر اتروائی ہے جب کہ حقیقت میں ایسا کچھ نہیں ہوتا محض دوسروں کو دھوکا دینے کی خاطر اور اور اپنی نفسی خواہش کی تسکین کی خاطر ان تاریخی مقامات تک نہ پہنچ پانے والے لوگ ایسی اوچھی حرکات کرتے ہیں۔ تارڑ نے سماجی تناظر میں اس غلط روش کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ٹکٹ خرید کر باہر نکلا تو باب الخمر کے پہلو میں براجمان فوٹو گرافروں نے گھیر لیا۔

"موروں کے بادشاہ کے لباس میں فوٹو اتروائے۔۔۔ خنجر بھی ہے، تلوار بھی ہے، دستار بھی ہے۔۔۔۔۔۔۔"

ایک زمانے میں میو ہسپتال لاہور کی بیرونی دیوار کے سائے میں فوٹو گرافروں کے غول کے غول سیاہ پردے لٹکائے چمگادڑوں کی طرح بیٹھے نظر آتے تھے۔ شوقین حضرات کے لیے پس منظر کے طور پر منقش پردے بھی موجود تھے جن پر تاج محل اور شالیمار کے ایسے ایسے نقشے دیکھنے کو ملتے تھے کہ اصل عمارت دیکھنے کے خیال سے ہی وحشت ہوتی تھی۔ چار آنے میں تاج محل کے آگے اکڑ کر اس طرح تصویر کھنچوائے جیسے آپ ابھی ابھی اس عمارت کی تعمیر سے فارغ ہوئے ہیں۔ یہاں بھی الحمرا کے تصویری پردوں کے آگے درجنوں سیاح عرب لباس میں ملبوس تصویریں اتروا رہے تھے۔ بوڑھے امریکی بڑی بڑی پگڑیاں باندھے ہاتھوں میں زنگ آلود خنجر لیے نقلی دانت نکال رہے ہیں اور عینک بدستور آنکھوں پر جمی ہے۔ ان کی تھل تھل کرتی بیویاں حرام سرا کی لونڈیوں کا سوانگ بھرے آنکھوں تلے نقاب، کندھے پر سراحی اور دیدے مٹکا رہی ہیں۔" (۲۳)

یہاں مستنصر حسین تارڑ نے طنز کے گہرے نشتر چلائے ہیں۔ ”ایسے اکڑ کر تصویر اتروائے جیسے آپ ابھی بھی اس عمارت کی تصویر سے فارغ ہوئے ہیں“، ”بوڑھے امریکی بڑی بڑی پگڑیاں باندھے ہاتھوں میں زنگ آلود خنجر لیے نقلی دانت نکال رہے ہیں اور عینک بدستور آنکھوں پر جمی ہے۔ ان کی تھل تھل کرتی بیویاں حرام سرا کی لونڈیوں کا سوانگ بھرے آنکھوں تلے نقاب، کندھے پر سراحی اور دیدے مٹکا رہی ہیں۔“ ایسے جملے ہیں جو طنزیہ انداز میں لکھے گئے ہیں۔ ان جملوں سے لوگوں کا دوغلا پن عیاں ہو رہا ہے جس کی اصلاح کے لیے تارڑ صاحب نے اس روش کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو تارڑ کے ہاں چیزوں کو دیکھنے کا اپنا ایک خاص انداز ہے۔ وہ اس انداز سے نہ صرف چیزوں کو دیکھتے ہیں بلکہ ان میں پائی جانے والی منفی روشوں تک بھی رسائی حاصل کر کے حقیقت حال کو سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں میں پائے جانے والے سماجی طنز کا موازنہ جب ہم عطاء الحق قاسمی کی سماجی طنز نگاری سے کرتے ہیں تو یہاں ان کے اور قاسمی کے ہاں بہت سے اشتراکات کے ساتھ ساتھ کئی معاملات میں دونوں کی اپنی اپنی انفرادیت بھی سامنے آتی ہے۔ اس انفرادیت کی بڑی وجہ وہ مقاصد ہیں جن کے لیے یہ اسفار کیے گئے۔ عطاء الحق قاسمی کے ہاں زیادہ تر رسم و رواج اور عادات کے حوالے سے سماجی طنز کے عناصر ملتے ہیں۔ انہوں نے لوگوں کی شادی بیاہ کی رسومات کے ساتھ ساتھ اس سماج کی دیگر رسومات میں پائی جانے والی بدحالی اور منفی رویوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے، جب کہ تارڑ صاحب کے ہاں اقدار کی پامالی پر طنز ملتا ہے اس کے علاوہ سماج میں دوسروں کو اس قدر دھوکے میں مبتلا کرنے کی روش پر طنز ملتا ہے جس میں پڑ کر وہ اپنے آپ کو دوغلا پن میں ڈھال کر بھی فخر کرتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ عطاء الحق قاسمی نے جو اسفار کیے ہیں وہ یا تو سفارت کاری کے دوران ان کے فرائض کی ادائیگی کے لیے تھے یا پھر مختلف کمپنیوں اور تنظیموں کی دعوت پر انہوں نے کیے۔ یوں ان کا واسطہ زیادہ تر بیرون میں شہری زندگی سے پڑا۔ انہوں نے شہری زندگی میں پائی جانے والی خرابیوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے جب کہ مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے ان کے سیاحت کے ذوق کی تسکین کے لیے تھے۔ انہوں نے شہروں کے ساتھ ساتھ دیہاتوں، کھنڈرات اور ساحل سمندر تک رسائی بھی خالصتاً سیاحت کے حوالے سے حاصل کی۔ یوں انہوں نے حقیقی زندگی اور بناوٹی زندگی میں پائے جانے والے تضادات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان تضادات کی وجہ سے ان معاشروں میں پروان چڑھنے والی منفی روشوں کو طنز کا نشانہ بنایا۔

عطاء الحق قاسمی نے بیرون ملک مختلف تقریبات اور مشاعروں میں شرکت کی۔ ان تقریبات اور مشاعروں کی وجہ سے انہوں نے وہاں کے متوسط اور اعلیٰ طبقے کی زندگیوں کو قریب سے دیکھا اور ان زندگیوں میں پائی جانے والی خرافات کو طنز کا نشانہ بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سفر ناموں میں شہری زندگی اور تقریبات کی عکاسی زیادہ ملتی ہے، جب کہ مستنصر حسین تارڑ نے ایک سیاح کی طرح دیہاتی زندگی اور غریب طبقے کی زندگیوں کو قریب سے دیکھا۔ اس سیاحت کے دوران میں انہوں نے غریب طبقے میں پائی جانے والے بعض ایسے منفی رجحانات کو سماجی طنز کا نشانہ بناتے ہوئے اجاگر کرنے کی کوشش کی جن میں پڑ کر وہ خود کو نمایاں کر کے اعلیٰ طبقے کے افراد کے طور پر سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کہیں نہ کہیں ان کی یہ کوشش ان کے دوغلے اور کھوکھلے پن کی چغلی کھا جاتی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ غریب طبقہ خود نمائی کا شکار ہوتا نظر آتا ہے۔ وہ غربت میں رہ کر اپنی اصلیت کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح کے منفی رجحانات کو مستنصر حسین تارڑ نے اپنے سفر ناموں میں سماجی حوالے سے گہرے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

ہر ادیب کو چیزوں کو دیکھنے کا اپنا ایک انداز ہوتا ہے۔ وہ جس سماج کا مشاہدہ کر رہا ہوتا ہے اس سماج میں اس کے پہنچنے کے مقصد سے لے کر اس سماج میں پائی جانے والی مختلف رسوم و روایات وغیرہ تک ہر چیز اس پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس کی تحریر کو متاثر کر کے دوسرے ادیبوں سے انفرادیت عطا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عطاء الحق قاسمی اور مستنصر حسین تارڑ دونوں کے ہاں سماجی طنز کے گہرے نشتر اپنے اپنے انداز میں ملتے ہیں۔ موازنہ کے دوران میں کسی ایک کو کسی دوسرے پر برتری دینا نہ مقصود ہے اور نہ ہی یہ عمل کوئی بہتر نتائج کا حامل ہے۔ اس موازنے کا مقصد دونوں کے سماج کو دیکھنے کے انداز اور سماج میں پائی جانے والی منفی سرگرمیوں کو اجاگر کرنے کے انداز کا پتہ چلانا ہے۔ یوں یہ کہا جا سکتا ہے مستنصر حسین تارڑ اور عطاء الحق قاسمی نے جن مقاصد کے لیے یہ اسفار کیے تھے ان مقاصد کی رُو سے ان دونوں کے سفر ناموں میں سماجی طنز کا بہترین اظہار ملتا ہے جو ان سماجوں میں پائی جانے والی غلط روشوں اور منفی رجحانات کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ سماج طنز نگاری کے حوالے سے مستنصر حسین تارڑ اور عطاء الحق قاسمی دونوں کی خدمات لائق تحسین ہیں۔

جمیل الدین عالی

جمیل الدین عالی کا شمار اردو کے ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے نثر اور شاعری دونوں حوالوں سے ارد ادب کو خاصا مفید سرمایہ فراہم کیا ہے۔ ان کی شاعری میں جہاں عصری سماج کی عکاسی ملتی ہے وہاں ان کی نثر اور خاص طور پر سفر ناموں میں بھی سماج کے مختلف حالات اور سماج میں پائی جانے والی خرافات کا ذکر اور خرافات پر طنز ملتا ہے۔ جمیل الدین عالی کے دو معروف سفر نامے ہیں ایک سفر نامہ "تماشا میرے آگے" کے نام سے ہے جبکہ دوسرے سفر نامے کو انہوں نے "دنیا میرے آگے" کا نام دیا ہے۔ "تماشا میرے آگے" ان کا وہ سفر نامہ ہے جس میں جرمنی، اٹلی، ہالینڈ، پیرس، سوئٹزرلینڈ اور امریکہ کے اسفر کا تذکرہ ہے۔ اس سفر نامے میں انہوں نے ان ممالک کے نظام سیاست، سماجی روایات اور سماج میں مختلف طبقات کے مابین پائی جانے وال کشمکش کو بھی نمایاں کیا ہے۔

موضوع کی مناسنبت سے اس سفر نامے کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جمیل الدین عالی نے اس سفر نامے میں ان ممالک کے سماج کا انتہائی باریک بینی اور گہری نظر سے مشاہدہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سماج میں پائی جانے والی رسوم وروایات کی عکاسی کے ساتھ ساتھ ان ممالک کے سماج میں پائی جانے والی خرافات کو بھی انہوں نے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کا انداز بیان خاصا دلچسپ ہے۔ وہ تحریر میں زیادہ تر متکلم راوی کی تکنیک اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ قاری کو اپنے ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ سماجی طنز کے حوالے سے اس سفر نامے کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ جمیل الدین عالی کے ہاں سماج اور سیاست کی ناہمواریوں کو طنز کا نشانہ بنانے کا اپنا ایک خاص انداز ہے۔ وہ بات سے بات پیدا کرنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں اور اس مقصد کے لیے وہ ایک بات سے دوسری بات کو ملا کر ایسی فضا تشکیل دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جس میں قاری ان کی تحریر کے سحر میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ مختلف چیزوں کے درمیان تعلق پیدا کر کے بات سے بات نکالنے اور طنز کے نشتر چلانے کے حوالے سے ایک مثال ملاحظہ ہو:

"اس شہر کی تقسیم با قاعدہ خطوط میں نہیں ہوئی بلکہ کٹی پھٹی ہے۔ گلی گلی، سڑک سڑک بٹی پڑی ہے۔ کونے کھدرے تک تقسیم شدہ ہیں۔ ایک گلی کا ایک نکڑ مغرب میں پڑتا ہے تو اسی نکڑ کا دوسرا سرا مشرق میں ہے۔ کسی مکان کی دیوار مشرق میں اور دروازہ مغربی علاقے میں ہے بعض اوقات بلکہ اکثر اوقات سخت گھپلا ہو جاتا ہے۔ مگر گھپلا تو بیسویں صدی کی عالمی سیاست میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ گھپلا نہ ہو تو لوگ بڑی بڑی نوکریاں کیسے حاصل کریں اور مسائل کے ایکسپرٹ کیسے کہلائیں۔" (۲۴)

یہاں مکانات اور گلیون میں گھپلے کی بات کرتے ہوئے انہوں نے گھپلے کو عالمی سیاست سے جوڑ کر تحریر میں روانی قائم رکھتے ہوئے خوب صورتی پیدا کی اور پھر عالمی سیاست کے ساتھ ساتھ گھپلے کے ذریعے لوگوں کا نوکریاں حاصل کرنا اور اعلیٰ عہدوں تک پہنچنا ایسا لطیف طنز ہے جو سماج میں میرٹ کی پس پشت ڈالنے کی عکاسی کر رہا ہے۔ یہ جمیل الدین عالی کی منفرد خصوصیت ہے کہ انہوں نے تحریر میں ایک ہی جگہ ایک ہی لفظ سے مختلف کام لیتے ہوئے سماجی برائی کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

جمیل الدین عالی کے سفر نامے "تماشا میرے آگے" کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا سیاسی شعور بھی خاصا وسیع ہے۔ وہ سماج کے باشندوں کے سیاسی شعور سے بھی آگاہ ہیں۔ انہیں اس بات کا بھی گلہ ہے لوگ ادب سے بے بہرہ ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کی مثال یوں لے لیجیے کہ ایک ہی زمانے میں پیدا ہونے اور پروان چڑھنے والے ادیب اور سیاست دان میں سے لوگ سیاست دان کو تو جزیات سمیت یاد رکھتے ہیں جب کہ ادیب کے نام سے بھی واقف نہیں ہوتے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ سماج کے باشندوں کو ادب سے لگاؤ نہیں حالانکہ ادب سماج کی بہتری کے لیے جتنا کام کرتا ہے اتنا سیاست نہیں کرتی لیکن لوگ ادب میں دلچسپی نہیں لیتے۔ اس کی ایک جھلک جمیل الدین عالی کے سفر نامے "تماشا میرے آگے" کے سے ملاحظہ ہو:

"مگر یہ منٹو کون ہے؟ انہوں نے پوچھا

"منٹو ہمارا ایک زبردست ادیب تھا جو طوائفوں اور جنسی مسائل پر لکھتا تھا۔"

"مگر ہم نے تو اس کا نام کہیں نہیں سنا"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم نے غالب کا نام سنا ہے؟

"نہیں"

میر تقی میر کا نام"

"نہیں"

"تو پھر کس کا نام سنا ہے"

"مسٹر گاندھی کا جو نیم برہنہ رہتے تھے اور نظام حیدر آباد کا جس کے جوتوں میں لعل جڑے ہوئے ہیں اور مسٹر جناح کا جنھوں نے پاکستان بنایا۔" (۲۵)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں کو ادب سے کتنی دلچسپی ہے اور سیاست سے وہ کس حد تک لگاؤ رکھتے ہیں۔ جمیل الدین عالی نے سماجی طنز کا ہتھیار استعمال کرتے ہوئے اس سماجی روش کو اس انداز میں نمایاں کیا ہے کہ لوگوں کے مختلف رجحانات اور مختلف امور میں دلچسپیاں بھی سامنے آنے لگتی ہیں۔

سماجی طنز کے حوالے سے جمیل الدین عالی کی ایک جہت پاکستان میں انگریزی زبان کے ضرورت سے زیادہ عمل دخل کے حوالے سے بھی سامنے آتی ہے۔ اردو ہماری قومی زبان ہے اور بد قسمتی سے کئی سال گزرنے کے باوجود ابھی تک یہ دفتری زبان نہیں بن پائی۔ اس کے دفتری زبان نہ بننے کی بڑی وجہ انگریزی کا حد سے زیادہ بڑا ہوا عمل دخل ہے۔ اب تو انگریزی صرف دفاتر ہی میں نہیں بلکہ سماج میں عام ہوتی جا رہی ہے۔ آپ کسی بھی پڑھے لکھے شخص سے بات کر کے دیکھ لیں وہ اردو بولتے ہوئے بھی بہت سے الفاظ انگریزی کے استعمال کرتا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی پاکستانی سماج میں بڑھتی اور اپنی جڑیں مضبوط کرتی جا رہی ہے۔ جمیل الدین عالی نے سماج میں انگریزی کے اس بڑھتے ہوئے چلن کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے لیکن یہاں انہوں نے ایک ایسا لطیف انداز اختیار کیا ہے کہ قاری ان کے فن کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انہوں نے غیر ممالک کے باشندے کے منہ سے یہ الفاظ اس طرح ادا کروائے ہیں:

"جب سے ہمارے ملک کے تعلقات آپ سے بڑھے ہیں اور کاروباری ادارے آپ کے ہاں قائم ہوئے ہیں ہماری یونی ورسٹی میں بڑا شور وغل ہوا کہ ایشیائی زبانیں سیکھنی چاہئیں۔ چنانچہ ہمارے ہاں کچھ انجینئرز داخل کیے گئے کہ بھئی یہ پاکستان جانے والے ہیں انھیں وہاں کی زبان سکھائیں۔ وہ لوگ کوئی دس دس مہینے پڑھائے گئے اور پھر آپ کے ہاں بھیجے گئے۔ پھر باقاعدہ کلاسیں کھولی گئیں کہ اب تو آنا جانا شروع ہو ہی گیا ہے۔ مگر ہوا یہ کہ ان میں سے چند آدمی چھٹیوں پر آئے اور ہم سے ملے تو انہوں نے کہا ہمارا سب وقت ضائع ہو گیا۔ پاکستان کے لیے کوئی ایشیائی زبان سیکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہاں سب کام کے لوگ انگریزی بولتے ہیں، جو مزدور بولتے نہیں وہ سمجھ ضرور لیتے ہیں۔" (۲۶)

اپنی زبان سے سوتیلوں جیسا سلوک کرنے والوں کو جب دیر غیر میں ایسے جملے سننے کو ملتے ہیں تو انتہائی کوفت ہوتی ہے۔ اگر اردو کو خود پاکستان کے اندر ترقی دی جاتی اور اسے اس کا صحیح مقام دیا جاتا تو غیر ممالک سے پاکستان کا رخ کرنے والے لازمی طور پر اپنے اپنے ممالک میں اردو سکھانے کے مراکز قائم کرتے اور یوں اردو کا دائرہ پوری دنیا میں پھیلتا چلا جاتا۔ جب پاکستان میں بھی انگریزی کو ہی اپنانے پر فخر کیا جانے لگا تو غیر ممالک نے اردو سیکھنے سے روگردانی اختیار کرنا شروع کر دی کیونکہ اب ان کی یہ ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ ان کا مقصد یہاں بھی انگریزی ہی سے پورا ہو رہا تھا۔ جمیل الدین عالی نے اس حقیقت کی طرف طنزیہ انداز میں اشارہ کیا ہے جو قومیں اپنی زبان کی ترویج کی خود کوشش نہیں کرتیں اور اپنی زبان کو خود اہمیت نہیں دیتیں دوسری اقوام بھی ان کی زبان کو پس پشت ڈال دیتی ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا سماجی المیہ ہے جو اردو کی ناقدری کے حوالے سے ہمارے سماج میں پروان چڑھ رہا ہے۔

اس سماجی المیے کے ساتھ ایک اور سماجی المیہ جو جمیل الدین عالی کے اس سفر نامے میں طنز کا نشانہ بنتا نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ لوگوں کے کارنامے خواہ وہ کسی بھی نوعیت کے ہوں اس وقت ہی یاد رہتے ہیں جب ان لوگوں کی اپنی سماجی حیثیت بلند مرتبہ ہو۔ حقیقی حق داروں کی بجائے دوسروں کو ناموری عطا کرنے کی سماجی روش سماج میں اہل اور قابل لوگوں کی ناقدری کا باعث بن رہی ہے۔ جمیل الدین عالی نے اپنے سفر نامے میں اس غلط سماجی روش

کی طرف بھی طنزیہ انداز میں کئی جگہوں پر اشارہ کیا ہے۔ انہوں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے سماج میں لوگوں کو ناموری صرف کارناموں سے نہیں ملتی بلکہ بلند سماج مرتبے کا ہونا ضروری ہے۔ اس بارے میں ان کے سفر نامے "تماشا میرے آگے" سے یہ جملے ملاحظہ ہوں:

> "یہ فوارے ۱۷۵۳ء میں تعمیر ہوئے۔ بنایا ایک بیچارے فن کار سالوی نے مگر اب تک مشہور یہی ہے کہ ان کا خاکہ بھی عظیم معمار برنینی نے بنا رکھا تھا۔ سچ ہے بڑائی کو بڑائی کھینچتی ہے۔" (۲۷)

جمیل الدین عالی کا دوسرا سفر نامہ "تماشا میرے آگے" بھی سماجی طنز کے حوالے سے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس سفر نامے میں بھی انہوں نے بہت سی ایسی سماجی ناہمواریوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے جو سماج کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہیں۔ قومی زبان کی ناقدری کے حوالے سے "تماشا میرے آگے" میں ان کے طنز پر بات گذشتہ صفحات میں کی جا چکی ہے۔ "دنیا میرے آگے" میں بھی انہوں نے قومی زبان کی ناقدری کرنے والے عناصر کو خوب طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کے نزدیک قومی زبان کی اہمیت بہت زیادہ ہے یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں بھی اس کی ناقدری دیکھتے ہیں اس پر اپنے جذبات کا اظہار ضرور کرتے ہیں۔ "دنیا میرے آگے" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "ہمارے ملک میں حکومت قومی زبان بولنے لگے تو عوام کے خوش ہونے سے پہلے پہلے خواص اور حکام نہ جانے کیا تختہ پلٹ دیں۔ ملک بھر کی انتظامی مشینری رک جائے۔ وکیل عدالتوں میں گھبرا جائیں، لائسنس جاری ہونے بند ہو جائیں۔ محکمہ ڈاک تار معطل ہو جائے اور مغرب زدہ خاندانوں کی فلرٹ کنواریاں اپنے عاشقوں کے سامنے گونگی نظر آئیں۔" (۲۸)

پاکستان میں اردو کے مکمل نفاذ میں حائل رکاوٹوں میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی مغرب زدہ طبقہ اشرافیہ ہے جن کے نزدیک اپنی قومی زبان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس سماجی المیے کو جمیل الدین عالی اپنی تحریروں میں خوب طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ سفر نامہ "دنیا میرے آگے" میں جمیل الدین عالی نے عراق کے سماج کو بھی خاص

طور پر طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ عراق کا وہ شہر جہاں اولیا کرام کے مزارات ہیں اور اپنی ایک خاص تہذیب اور ثقافتی اقدار کے حامل ہیں وہاں بھی مغربیت کس حد تک اثر انداز ہو چکی ہے اس سماجی بد حالی کو جمیل الدین عالی یوں طنزیہ انداز میں بیان کرتے ہیں:

> "عام عراقی شہری عربی جبے، دستار اور قبا سے آزاد ہیں۔ کھلے گلے کی قمیصیں اور پتلو نہیں ۔۔۔۔۔۔۔وہی اسکرٹ اور کھلی آستینوں کے بلاؤزر۔ اس شہر کے دونوں کونوں پر امام ابو حنیفہؒ اور غوثِ اعظم عبدالقادر جیلانیؒ کے مزارات ہیں او ر شہر کے بیچ میں کھلی آستینوں کے بلاؤذر اور اسکرٹ پہنے اور بال کٹائے سرخ رنگ کی عراقی خواتین اور بار اور نائٹ کلب۔" (۲۹)

جمیل الدین عالی کے سفر ناموں میں سماجی طنز کو موازنہ عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں سے کیا جائے تو دونوں کے ہاں سماج کے منفی رویوں پر خوب چوٹیں ملتی ہیں۔ جمیل الدین عالی اور عطاء الحق قاسمی کے ہاں سب سے بڑی مشترک قدر یہ ہے کہ دونوں کے سماجی طنز میں ہلکا سا مزاح کا عنصر بھی شامل ہو تا ہے۔ دونوں لطیف انداز میں سماجی ناہمواریوں کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ سماجی طنز کے حوالے سے جمیل الدین عالی کے ہاں قومی زبان خاص طور پر مد نظر رہتی ہے۔ انہوں نے کئی جگہوں پر سماج کی اس غلط روش کو طنز کا نشانہ بنایا ہے جس میں بہہ کر دوسروں کی دیکھا دیکھی لوگ اپنی قومی زبان سے غافل ہو جاتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی کے ہاں اس موضوع کو نہیں بر تا گیا بلکہ ان کی اپنی تحریروں میں بہت سے ایسے الفاظ دوسری زبانوں خاص طور پر انگریزی کے شامل ہیں جن کے اردو متبادل موجود ہیں۔ جمیل الدین عالی کے ہاں ماضی کی زریں روایات اور اقدار کی پامالی کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے جب کہ قاسمی کے ہاں مختلف سماجوں میں پائی جانے والی رسوم میں دوغلے پن کو طنزیہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ عریانیت و فحاشی پر طنز دونوں سفر نامہ نگاروں کے ہاں ملتا ہے لیکن عالی نے اس منفی رویے کو ماضی کی روایات کے ساتھ موازنہ کرتے ہوئے بیان کیا ہے جب کہ قاسمی نے اس فحاشی و عریانی کو مغربی سماج کے تناظر میں دیکھانے کی کوشش کی ہے۔ مجموعی طور پر دونوں سفر نامہ نگاروں کے ہاں سماجی ناہمواریوں کے حوالے سے اچھے انداز میں سماجی طنز کی مثالیں ملتی ہیں۔

جمیل الدین کے سفر ناموں میں سماجی طنز کا موازنہ عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں سے کیا جائے تو دونوں کے ہاں سماج کے منفی رویوں پر خوب چوٹیں ملتی ہیں۔ جمیل الدین عالی اور عطاء الحق قاسمی کے ہاں سب سے بڑی مشترک قدر یہ ہے کہ دونوں کے سماجی طنز میں ہلکا سا مزاح کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ دونوں لطیف انداز میں ناہمواریوں کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ سماجی طنز کے حوالے سے جمیل الدین عالی کے ہاں قومی زبان خاص طور پر مدِ نظر رہتی ہے۔ انہوں نے کئی جگہوں پر سماج کی اس غلط روش کو طنز کا نشانہ بنایا ہے جس رہ کر دوسروں کی دیکھا دیکھی اپنی قومی زبان سے غافل ہوتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی کے ہاں اس موضوع کو نہیں برتا گیا بلکہ ان کی اپنی تحریروں میں بہت سے ایسے الفاظ دوسری زبان خاص طور پر انگریزی کے موجود ہیں۔ جمیل الدین عالی کے ہاں ماضی کی زریں روایات اور اقدار کی پامالی کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے جبکہ قاسمی کے ہاں مختلف سماجوں میں پائی جانے والی رسوم سے دوغلے پن کو طنزیہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اورانیت اور فحاشی پر طنز دونوں سفر نامہ نگاروں کے ہاں جبکہ عالی کے اس منفی رویوں کو ماضی کی روایات کے ساتھ موازنہ کرتے ہوئے بیان کیا ہے جبکہ قاسمی نے فحاشی اور عریانی کو مغربی سماج کے تناظر میں دکھانے کی کوشش کی ہے۔ مجموعی طور پر دونوں سفر نامہ نگاروں کے ہاں سماجی ناہمواریوں کے حوالے سے اچھے انداز میں طنز کی مثالیں ملتی ہیں۔ عطاء الحق قاسمی، مستنصر حسین تارڑ اور جمیل الدین عالی کے سفر ناموں میں سماجی طنز کا تقابلی جائزہ لینے سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ ان تینوں سفر نامہ نگاروں کے ہاں سماجی طنز کا اظہار ہوا اس اظہار میں جہاں ان علاقوں کے سماج کے رویوں کا عمل دخل ان تینوں میں اختلاف پیدا کرتا ہے وہاں تینوں سفر نامہ نگاروں کی شخصیت کو بھی خاصا عمل دخل حاصل ہے۔

جمیل الدین عالی، مستنصر حسین تارڑ کی نسبت عطاء الحق قاسمی کے ہاں سماجی طنز کے اظہار میں لطافت زیادہ نکلی ہے اس کی بڑی وجہ قاسمی کی حسی مزاح ہے۔ وہ بڑی سے بڑی ناہمواریوں کو بھی ظریفانہ پیرائے میں بیان کرنے کی خوب صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس صلاحیت کے استعمال سے بخوبی واقف ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ سماجی ناہمواری کو طنز کا نشانہ بناتے وقت قاری کو تاریخ میں لے جاتے ہیں۔ جمیل الدین عالی کے ہاں سنجیدہ رویے سامنے آتے ہیں جبکہ عطاء الحق قاسمی اس ناہمواری کو اسی سماج کے آئینے میں رکھ کر لطیف طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ اس سے

قاری سماج کے منفی رویوں کو سمجھنے میں آسانی رکھتا ہے ۔ مستنصر حسین تارڑ اور جمیل الدین عالی کی نسبت عطاءالحق قاسمی کے ہاں سماجی رسومات کا ذکر زیادہ ملتا ہے۔ یہ سماجی رسومات ہی کسی سماج کی سمت متعین کرتی ہیں۔ یہاں یہ نتیجہ خیز بات سامنے آتی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کے اور جمیل الدین عالی کے ہاں ہمیں سماج ایسا نظر آتا ہے جیسا وہ ہے اُس سماج میں جو وہ منفی رویے اُن پر وہ طنز کرتے ہیں لیکن اس کے متوازی کسی دوسرے سماج کو پیش نہیں کرتے جبکہ عطاءالحق قاسمی کے منفی رویوں اور ناہمواریوں کو طنز کا نشانہ بنا کر ان کے عیب کو عیاں کرتے ہیں وہاں ان کے سفر ناموں میں مشرقی اور مغربی سماج کا تقابل بھی ساتھ ساتھ ملتا ہے۔اس تقابل کے ذریعے سماج کی اصلاح بھی کرتے چلے جاتے ہیں یوں یہ کہاں جا سکتا ہے کہ عطاءالحق قاسمی کے ہاں سماجی طنز مستنصر حسین تارڑ اور جمیل الدین عالی کی نسبت زیادہ وسعت اور تنوع لیے ہوئے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ محمد افضال بٹ، ڈاکٹر، اردو ناول میں سماجی شعور، طبع اول، یورپ اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۱۲

۲۔ فیصل لیاقت علی، طنز و مزاح و اصطلاحات، مشمولہ اردو اکیڈمی، بہاولپور، ۲۰۱۷ء، ص ۱۲

۳۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اشاعت دوم، اسلام آباد، س ن، ص ۱۴۱

۴۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۱۴۳

۵۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۲۹۱

۶۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۱۲۸

۷۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۱۲۲

۸۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۱۷۳

۹۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۱۷۳

۱۰۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۲۵۵

۱۱۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۲۴۵

۱۲۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۲۴۶

۱۳۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص ۲۶۹

۱۴۔ انور سجاد، مشمولہ، تسطیر (سہ ماہی)، شمارہ نمبر ۹، جولائی تا اگست ۱۹۹۹ء، لاہور، ص ۲۸

۱۵۔ سلمان باسط، خاکہ گل باتیا، خاکی خاکے، گندھارا پبلشرز، ۱۹۹۷ء، س ن، راولپنڈی، ص ۴۵

۱۶۔ مستنصر حسین تارڑ، نکلے تیری تلاش میں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۱۲

۱۷۔ مستنصر حسین تارڑ، نکلے تیری تلاش میں، س ن، ص ۵۱

۱۸۔ مستنصر حسین تارڑ، نکلے تیری تلاش میں، س ن، ص ۴۲

۱۹۔ مستنصر حسین تارڑ، نکلے تیری تلاش میں، س ن، ص ۵۲

۲۰۔ مستنصر حسین تارڑ، نکلے تیری تلاش میں، س ن، ص ۶۲

۲۱۔ مستنصر حسین تارڑ، اندلس میں اجنبی، سنگ میل پبلی کیشنز، طبع سوم، لاہور، ۱۹۸۴ء ، ص ۹۱

۲۲۔ مستنصر حسین تارڑ، اندلس میں اجنبی، ص ۱۳

۲۳۔ مستنصر حسین تارڑ، اندلس میں اجنبی، ص ۶۱۳

۲۴۔ جمیل الدین عالی، تماشا میرے آگے، شیخ غلام اینڈ سنز، اشاعت سوم ،لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۳۲

۲۵۔ جمیل الدین عالی، تماشا میرے آگے، ص ۵۷

۲۶۔ جمیل الدین عالی، تماشا میرے آگے، ص ۶۷

۲۷۔ جمیل الدین عالی، تماشا میرے آگے، ص ۵۱۱

۲۸۔ جمیل الدین عالی، دنیا میرے آگے، ص ۸۳

۲۹۔ جمیل الدین عالی، دنیا میرے آگے، س ن، ص ۱۴

باب پنجم:

ماحصل

الف: مجموعی جائزہ

سفر نامے میں صرف متعلقہ علاقوں کے پیچ و خم کو ہی بیان نہیں کرتا۔ بلکہ گیسوئے وقت کی گروہوں اور کنڈلیوں کو بھی سہلانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ سفر نامے میں خطوں کی تاریخ سے لے جغرافیہ تک سیاسی و سماجی جبر سے فکری استحصال تک پھولوں کی باس سے ذہنی انسانی کی گنجلک نفسیاتی پیچیدگیوں تک پاما کی روانی سے بے بسی کی ارزانی تک رہن سہن سے رسوم و رواج تک اور کئی نادید و ناشید واقعات کو اپنے اندر سموئے ہوتے ہے۔ جدید سفر نامہ میں افسانوی رنگ دکھائی دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں دیگر ممالک کی معاشرت ان کے کلچر، رسوم و رواج کا اسلوب آزمانے کی کوشش ایسے سفر ناموں میں لفظ کو الٹنے، معنی کی معکوس صورت ابھارنے اور لطیفے کو بیانیہ انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مصنف منظر کو شریر آنکھوں سے دیکھ کر حیرتوں کو جگانے کے بجائے ناہمواریوں کو سامنے لاتا ہے جس سے وہ قاری کو بھی اپنی طرف متوجہ کرلیتا ہے تاکہ وہ اس تمسخر میں کھل کر قہقہہ لگائے۔ اردو ادب کے جدید سفر ناموں میں طنز و مزاح کا رجحان دکھائی دیتا ہے۔ گزشتہ نصف صدی میں ہمارے بہت سے ادیبوں اور مزاح نگاروں نے مختلف ممالک کے سفروں میں زندگی کی رنگینیوں اور ناہمواریوں کو بیان کیا ہے۔ اردو کے پہلے سفر نامہ نگار یوسف کمبل پوش لے کر موجودہ دور تک سفر نامے میں طنزیا شگفتگی کے نمونے ملتے ہیں۔ لیکن باقاعدہ مزاحیہ سفر ناموں کا آغاز قیام پاکستان کے بعد شروع ہوتا ہے۔

مزاحیہ سفر ناموں کو لکھنے والوں میں عطاء الحق قاسمی بھی شامل ہیں۔ اردو ادب میں عطاء الحق قاسمی ایک مایہ ناز کالم نگار، سفر نامہ نگار اور خاکہ نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے جس جس صنف میں خامہ فرسائی اس کو اوجِ کمال تک پہنچایا ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے بہت کم وقت میں سدا بہار پذیرائی حاصل کی۔ ان کی عقیدت مندی کی وجہ سے ایک اجنبی شخص بھی ان سے مانوس ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ ان کا خالص پن ہے جس میں کوئی بھی تضاد نظر نہیں آتا۔ ان کے لہجے کی نرمی اور خوش گفتاری کی وجہ سے لوگ ان سے متاثر ہوتے ہیں۔ عطاء الحق

قاسمی نہایت ملنسار اور شفیق شخصیت کے مالک ہیں اور ان کی ذات ان کی تحریروں کے اندر ادبیت اور جاذبیت دکھائی دیتی ہے۔ ہمارے معاشرے کے وہ لوگ جو ہنسنا بھول گئے ہیں۔ ان کے لیے عطاء الحق قاسمی کی تحریریں کسی جل پری سے کمتر نہیں ہیں جو اداس چہروں کی حسرت بکھیر دیتی ہے۔ عطاء الحق قاسمی ۲۰۰۲ء کو ایف سی کالج سے پروفیسر کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوتے "اخبار جنگ" میں روزن دیوار کے نام سے شائع ہوتے رہے اور ایک رسالہ معاصر کے نام سے نکالتے رہے جس کو معیاری مجلوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ حکومت پنجاب کی طرف سے انھیں الحمرا آرٹس کونسل کا عہدہ دیا گیا۔

عطاء الحق قاسمی نے بطور سفیر کئی ممالک کے دورے کیے۔ یورپ اور امریکہ، سینٹ لوئس نیو یارک ایمسٹراڈیم بھارت، جرمنی، سویڈن ناروے وغیرہ شامل ہیں۔ جہاں سے بھی گزرتے ہیں وہاں اپنی حاضر جوابی، وسیع المشرقی اور مردانہ وجاہت کے نشان چھوڑتے چلے جاتے ہیں۔ وہ جس ملک میں بھی جاتے ہیں وہاں کی حسینائیں ان کی توجہ کا مرکز رہتی ہیں۔ وہ مختلف جگہوں پر خود بھی ان حسیناؤں کی توجہ کا مرکز بنے ہوتے ہیں یہاں اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ سب ان کے اسلوب کا کرشمہ ہیں۔ وہ اپنے اسلوب میں اس حد تک کامیاب ہیں۔ ان واقعات عقل کا گمان ہی کیا جا سکتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی کا اسلوب نہایت جاندار ہے۔ ان کے سفر ناموں میں شوخی و شرارت پائی جاتی ہے لیکن اس کی ہلکی ہلکی موج ہلکورے لیتی ہے جسے کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے سفر ناموں کو لطائف اور پیروڈیوں سے عمدہ بنا دیتے ہیں۔ سارے سفر ناموں میں اس طرح دکھائی دیتا ہے وہ قاری کو بھی شریک سفر رکھتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی دورانِ سفر ہر معاشرے اور اس کے مظاہر و مراسم کا گہری نظر سے جائزہ لیتے ہیں۔ وہ وہاں کی تہذیبی اور اخلاقی کجرویوں پر لطیف طنز کرتے ہیں جس سے وہ قاری میں ردعمل پیدا کرنا چاہتے ہیں اس کے لیے واعظ نہیں بنتا بلکہ یہ ردعمل خود سفر ناموں کے باطن سے پھوٹتا ہے۔ ان کا یہ طنز کرنے کا انداز قاری کے دل کو نفوذ کر دیتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی صرف مغرب کے ہی نقاد نہیں ہیں بلکہ مشرق کی کجرویوں پر بھی بات کرتے ہیں وہ نہ صرف غیر ملکی لوگوں سے ملتا ہے بلکہ وہاں رہنے والے پاکستانیوں سے بھی ملتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے "بابے دی بائم" میں رہنے والے پاکستانیوں کی بے بسی کا بھی تذکرہ

کیاہے اور خود کو خوش قسمت محسوس کرتے ہیں۔ ہم پاکستان میں رہتے ہیں۔ قاسمی نے اپنے سفر ناموں میں جگہ جگہ اپنی تہذیب کا موازنہ مغرب کی تہذیب سے بھی کرتے ہیں اور پھر شکر بھی ادا کرتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ ان بیمار ذہن کے لوگوں اور نام نہاد کی ترقی سے پاک ہے۔ مصنف جو شیلے نوجوانوں کی طرح مغرب سے مرعوب نہیں بلکہ کھلے دل و دماغ سے ان کی برائیوں پر طنز کرتے ہیں۔ جہاں وہ مغرب تہذیبوں کے عیبوں کے پردوں کو فاش کرتے ہیں وہیں اپنے ملک کی غربت اور بے روزگاری اور جہالت جیسے مسائل بیان کرتے ہوئے طنز و مزاح کو اتناہاوی کر دیتے ہیں۔ اہلِ وطن شرمندہ ہونے ہنسی ہنسی میں بات کو ہضم کر لیتے ہیں ان کا یہ انداز ایک سچے محب وطن ہونے کی دلیل ہے۔

عطاء الحق قاسمی کے چار سفر نامے منظر عام پر آچکے ہیں۔ "شوق آوارگی"(۱۹۹۰ء) ،" گوروں کے دیس میں"(۱۹۹۲ء)،" دلی دوراست" اور دنیاخوبصورت(۱۹۹۸ء) میں شائع ہو چکے ہیں۔عطاء الحق قاسمی کے ان سفر ناموں میں انیس بیس کے فرق کے ساتھ یکساں نوعیت کے حامل ہیں۔عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں چھوٹے چھوٹے عنوانات ملتے ہیں جن سے سفر ناموں کی رنگینی میں اضافہ ہو گیاہے۔عطاء الحق قاسمی نے ایک سیر کے طور پر کئی ممالک کا سفر کیاہے۔پہلا سفر نامہ "شوقِ آوارگی" یورپ اور امریکہ کے سفر کی کہانی ہے۔

"گوروں کے دیس میں" عطاء الحق قاسمی نے دورِ برطانیہ کی سفر بیتی کا ذکر کیاہے۔"گوروں کے دیس میں" عطاء الحق قاسمی نے دورِ برطانیہ کی سفر بیتی کا ذکر کیاہے۔ان کا یہ سفر نامہ برطانیہ کے تمام شہروں اور اس کے علاوہ فرانس، جرمنی ہالینڈ، ڈنمارک، سویڈن اور ناروے شامل ہیں۔ تیسرا سفر نامہ " دلی دوراست" یہ سفر نامہ بھارت کے دو دوروں کے احوال پر مشتمل ہے۔اس میں پہلا سفر ۱۹۷۰ء میں ایک زائر کی حیثیت سے کیا تھا اور دوسرا سفر انھوں نے ۱۹۸۵ء میں حیدر آباد دکن میں ہونے والی طنز و مزاح کے حوالے سے بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے کیا تھا۔ عطاء الحق قاسمی کا چوتھا سفر نامہ "دنیاخوبصورت ہے" جس میں سنگاپور اور آسٹریلیا کی روداد کو بیان کیا گیاہے۔یہ دورہ مطالعاتی اور تفریحی حوالے سے تھا۔

عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں لطیف طنز ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ وہ طنز کو مزاح کے پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے سفر نامے بے فکری سطح سے عاری نہیں ہونے دیتے۔ وہ طنز و مزاح کے ذریعے سوچ وبچار کی طرف مائل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے سفر نامے ایک سیاح کے سفری تاثرات پر مشتمل ہیں۔ وہ اپنے سفر ناموں میں طبقاتی کشمکش، منافقانہ رویوں، غیر منصفانہ رویوں، سماجی اونچ نیچ پر طنز کے ساتھ اخلاقی معاشی اور سیاسی تجزیوں کو بھی بیان کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے سفر نامہ نگاری کی روایت میں ان کو انفرادی مقام حاصل ہوا۔ مصنف اپنے سفر ناموں کو سفری کتاب نہیں بننے دیتے بلکہ تاثرات کو عصری سیاسی و سماسی اور معاشی و اخلاقی تناظر میں طنز و مزاح کی تکنیکوں کو استعمال کرتے ہوئے پیش کرتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں جن سماجی برائیوں پر طنز کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں وہ کثیر مثالیں میں ملتی ہیں۔ وہ مغرب میں جنسی آزادی کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ وہ ان رویوں پر کڑھتے ہیں کہ وہاں آزادی نسواں کے نام پر عورت کی کس قدر بے حرمتی کی جاتی ہے۔ افسوس کے ساتھ وہاں کی عورتیں بھی اپنی تذلیل نہیں سمجھتیں بلکہ ایک کاروبار سمجھتی ہیں۔ دولت کمانے کی خاطر اپنی عصمت کا سودا کر دیتی ہیں ایسا کرنا مہذب قوموں کا شیوا نہیں ہوتا ہے۔ "بزنس لو" (کاروباری محبت کے نعرے) لگا کہ یہ خواتین کیسے مہذب بن سکتی ہیں؟ مغرب ممالک میں عورت کا وجود ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گیا ہے۔ جہاں جنس پرستی کو قانونی تحفظ دیا جاتا ہو وہ قوم کیسے مہذب بن سکتی ہیں؟ یہ ممالک صنعتی ترقی کی وجہ سے وہاں پیسے کی ریل پیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قومیں ہمیں مہذب نظر آتی ہیں جتنی تذلیل عورت کی مغرب میں کی گئی شاید کہیں بھی ایسا نہیں کیا گیا ہو گا۔ مغرب کی روٹین بن گئی ہے۔ مغرب میں جنس پرستی کا جمعہ بازار قار لگتا ہے جن پر خریداری کی جاتی ہے۔ مصنف مغرب کی دوغلی پالیسی، نظم وضبط، اصولوں اور صنعتی ترقی دیکھ کر بھی اپنے ملک کی غربت کے ساتھ موازنہ کرتے ہوئے طنز کرتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی اپنے سفر ناموں میں انسانی جذبات کی عکاسی بھی کرتے۔ ان کے سفر نامے ایک روشن مینار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہاں جزئیات نگاری ہو یا منظر کشی ہو یا پھر حساس انسان کے دل سے نکلے ہوئے موتیوں کی طرح کے الفاظ یا طنز و مزاح میں لپٹے ہوئے واقعات بیان کیے ہوں یا پھر دم توڑتی روایات یا پھر کسی ملک کی جغرافیہ اور تاریخ کے بارے میں بتایا ہو خاص طور پر مغرب والوں کا اصل روپ یا پھر کسی معاشرے میں تقریب کا اہتمام کیا گیا ہو وہ تمام چیزوں کو اپنی فکری و فنی مہارت سے ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی کا یہ ایسا جادو ہے جو ہمیں دیگر سفر نامہ نگاروں کے ہاں کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں نے سیاسی صورتحال پر بھی کڑی تنقید کی ہے۔ عطاء الحق قاسمی کا مشاہدہ بہت گہرا ہے جس کی بنا پر وہ اپنے سفر نامہ میں یورپ اور امریکہ کے سفر کے دوران کیپیٹل ازم اور سوشلزم کا بھی موازنہ کرتے ہیں۔ وہ ان نظاموں کو انسان کی فلاح کے لیے مناسب نہیں سمجھتے۔ وہ اس نظام کو ہولناک ترین قرار دیتے ہیں کیونکہ وہ اس بات کو سمجھ گئے ہیں۔ ان نظاموں اور امریکہ اور یورپی ممالک پر کیا اثرات چھوڑتے ہیں۔ وہ صرف اسلامی اصولوں پر مبنی نظام کو ہی سیاسی اور معاشی نظام کی برائیوں سے پاک سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے سفر نامے "دلی دوراست" میں بھارت کی سیاسی زندگی پر بھی بات کرتے ہیں جس پر ان کے تیکھے جملوں سے طنز کی کاٹ گہری دکھائی دیتی ہے۔

عطاء الحق قاسمی اپنے سفر ناموں میں امریکہ اور یورپ سمیت مشرزقی بعید کے ممالک سنگاپور اور تھائی لینڈ جیسے ممالک کی اقتصادی حالت کے پس منظر میں معاشی صورتحال کو واضح کیا ہے۔ یورپی ممالک میں مکبز، شراب نوشی اور ستر شراب فروشی کے اڈے فقط پیسے کمانے کی غرض سے ہیں۔ وہاں پر یہ ذریعہ معاش کا یہ طریقہ عام ہے۔ اس کے برعکس اسلامی ممالک میں ایسا نہیں ہوتا۔ وہ سرمایہ دارانہ نظام کی بھی بات کرتے ہیں۔ وہ اس نظام کے خلاف ہیں۔ اس پر بھی کڑی تنقید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ سمجھتے ہیں اس نظام نے انسان کو مشینوں کو تابع بنا دیا ہے۔ یہ اس نظام کی وجہ سے لوگوں میں حرص اور سہوس پیدا ہو گیا ہے۔ اس نظام نے غریب آدمی کو مزید غریب اور امیر آدمی اور مزید امیر بنا دیا ہے۔ اس گلے سڑے بودار نظام کی وجہ آج انسان اخلاقی قدروں سے گر گیا ہے۔ اس نظام کے ہاتھ میں آکر انسان کٹھ پتلی بن کر رہ گیا ہے۔ عطاء الحق قاسمی اخلاقیات کے حوالے سے بھی بات کرتے ہیں کہ جب انسان اخلاقیات کے دائرے کو چھوڑ دیتا ہے تو وہ غلط راستے پر نکل جاتا ہے یہی وجہ ہے ہمارے یوری ممالک میں آزادی نسواں کے نام پر مبنی آزادی اخلاقی کمزوری کا نیارخ ہے۔ اس کے علاوہ وہ بتاتے ہیں نیویارک جو کہ دنیا کا طاقت ور ترین کاروباری ہونے کا اعزاز ہے وہاں پر بھی تیزی سے ہونے والی ترقی وہاں کے لوگوں کی زندگی کو انتہائی سفاک بنا دیا ہے۔ وہاں پر جسمانی طور پر کمزور شخص زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے تو ان کا خیال رکھنے والے کوئی نہ ہو تو ایسے عمر رسیدہ لوگوں کو اولاد بوڑھے ماں باپ کو علاج کے نام پر اولڈ ہوم چھوڑ دیتے ہیں تاکہ اپنی زندگی آگے مسائل کو با آسانی حل کر سکیں۔

عطاء الحق قاسمی کے اسلوب کی جڑیں اردو نثر کی کلاسیکی روایات تک پھیل چکی ہیں۔ عطاء الحق قاسمی نے اپنے سفر ناموں میں سادہ اور سلیس انداز بیان اختیار کیا۔ ان کا مقصد اپنے خیالات کا ابلاغ کرنا تھا۔ اس لیے انھوں نے اپنے نقطہ نظر اور ملک و قوم کی بقا کے لیے جو نثری اسلوب اختیار کیا وہ پھیکا اور بے رس نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک ادبی اسلوب ہے۔ ان کا یہ انداز انھیں دبستانِ سر سید کے لکھنے والوں سے ممتاز و ممیز کرتا ہے۔ ان کی تحریروں میں ہمیں ریاست لفظی، نکتہ سنجی اور بات سے بات کرنے کا انداز نظر آتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں واقعات کی رنگارنگی اور اسالیب کے تنوع کے امین ہیں۔ ان کے سفر نامے موضوعات اور تیکنیکس کے حوالے سے اپنی انفرادیت کے حامل ہیں۔ ان کی تحریروں میں ایک مخصوص رنگ ہے جو شعوری اور لاشعوری طور پر ان کی تحریروں میں سرایت کیا ہوا ہے وہ مخصوص رنگ طنز و مزاح کا ہے۔ عطاء الحق قاسمی مزاح کا ایک ایسا کامیاب حربہ ہے جس سے ان کے سفر نامے اردو ادب میں قابل قدر نگاہ سے دیکھے جاتے۔ عطاء الحق قاسمی طنز و مزاح کے تمام حربوں سے اچھی طرح واقف ہیں وہ طنز کی مختلف تیکنیکس کو اپنے سفر ناموں میں استعمال کرتے ہیں مثلاً ان کے ہاں موازنہ اور مقابلہ ملتا ہے۔ ذو معنویت، لفظی مزاح، تکرار لفظی، شعروں اور مصروں کی صورت میں رمز و کنایہ، لطیفے کا استعمال کر کے ٹھٹھہ پیدا کرتے۔ بعض جگہوں پر محاوروں کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ ان سب میں کامیاب پیروڈی ہے۔ عطاء الحق قاسمی سادہ اور سلیس زبان استعمال کرتے وہ صرف قومی زبان اردو کو بھی استعمال نہیں کرتے بلکہ ان کے سفر ناموں میں انگریزی اور پنجابی کے الفاظ بھی شامل ہیں۔

اس مقالے میں عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں کا تقابل ہمصر سفر نامہ نگاروں کے ساتھ کروایا گیا ہے۔ جن میں مستنصر حسین تارڑ اور جمیل الدین کے سفر ناموں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اس باب میں مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے میں "نکلے تیری تلاش میں" اور "اندلس میں اجنبی" اور جمیل الدین عالی کے سفر نامے "تماشا مرے آگے" اور "دنیا میرے آگے" کا عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں سماجی طنز کے حوالے سے تقابل کیا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ عصر حاضر کے مشہور ناول نگار، سفر نامہ نگار، افسانہ نگار، طنز و مزاح نگار، کالم نگار، سیاح، دانشور، اداکار، ٹی وی میزبان اور اچھے ادیب ہیں۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۸۵ء میں ہفتہ وار رسالے "قندیل" سے کیا۔ اس رسالے میں ایک سفر نامہ "لندن سے ماسکو" کے عنوان سے شائع ہوتا رہا۔ اس

کے بعد ان کی تحریروں کا سلسلہ با قاعدہ شروع ہوا۔ ۱۹۷۱ء میں ان کا پہلا سفر نامہ کتابی شکل میں نکلے تیری تلاش میں منظرِ عام پر آیا"۔ اس طرح انھوں نے ادبی زندگی کا آغاز سفر نامہ نویسی سے کیا۔ جس سے ان کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے نکلے تیری تلاش میں وہ ترکی، ایران، لندن، پیرس، سویڈن، سوئزر لینڈ، جرمنی، ڈنمارک، سویڈن، ناروے، برمنگھم اور فرانس کے حالات پر مشتمل ہے۔ وہ اپنے سفر نامے میں سماج کی ناہمواریوں کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں اور یورپی ممالک ہیں جنس پرستی اور عریانی کو بطور تجارت استعمال کرنے کی وجوہات بھی بتائی ہیں کہ وہاں حالات کچھ بھی، وہاں اہلِ یورپ بنیادی ضروریات کو صرف ضروریات پوری کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس قسم کے ان کی ترقی میں مائل نہیں ہو سکتے۔ وہاں کی ہونے والی سائنسی ترقی انسان کو انسان کے قریب تو کرتی مگر انسانیت سے کوسوں دور لے جاتی ہے۔ اس لیے آج کا انسان آس پاس کے رہنے والے انسانوں سے بے خبر ہے جو ہمارے سماج کی ایک تلخ حقیقت ہے۔ "اندلس میں اجنبی" سفر نامے کا دور ۱۹۷۲ء ہے۔

اس سفر نامے میں مصنف نے اندلس کی سرزمین کے بارے میں لکھا ہے اس سفر نامے میں ہونے والی ناہمواریوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے جس کی وجہ سے وہاں کا سماج زوال کا شکار ہو رہا تھا۔ وہاں کے معاشروں میں بڑھتی ہوئی جنس نگاری کا ذکر کرتے ہیں۔ چاہے وہ کسی بھی صورت میں ہو۔ مستنصر حسین کے سفر ناموں کو فکر و فن کے حوالے سے دیکھیں ان سیاسی، معاشرتی، جغرافیائی، تہذیبی، تاریخی اور داخلی عناصر ملتے ہیں۔ اس کے سفر ناموں میں سادہ اور شگفتہ اسلوب، افسانوی طرزِ گفتگو طنز و مزاح کا استعمال رومانویت، جذبات کی دل کش عکاسی نے ان کے سفر ناموں کو کمال درجہ پر پہنچا دیا ہے۔ عطاء الحق قاسمی اور مستنصر حسین تارڑ کا سماجی طنز کے حوالے سے مقابلہ کروایا جائے تو وہاں پر بعض جگہوں پر افتراکات میں سامنے آتے ہیں جس سے ان کی انفرادیت بھی سامنے آتی ہے۔ عطاء الحق قاسمی کے دورانِ سفر لوگوں کے رویوں، رہن سہن لوگوں کی عادات و اطوار وہاں کی معیشت، سیاست اور اخلاقیت کے حوالے سے ہر پہلو بات کرتے ہیں کیونکہ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ان کے اسفار ہیں جو انھوں نے اسفار کیے تھے۔ وہ سفارت کاری کے دوران ان کے فرائض کی ادائیگی کے لیے تھے یا پھر مختلف کمپنیوں اور تنظیموں کے بلانے پر وہ اسفار کیے گئے تھے اس لیے انھوں نے ان ملکوں کو سماجی حوالے سے دیکھنے کے مواقع

ملے۔ اس لیے طنز صرف مغرب کی دوغلی پالیسیوں پر ہی نہیں کرتے بلکہ وہاں نظم وضبط اصولوں اور صنعتی ترقی کو دیکھ اپنے ملک کی غربت کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں۔ اپنے لوگوں کو بھی طنز کا نشانہ بناتے ہیں جبکہ مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے سیاحت کے ذوق کی تسکین پہنچانے کے لیے تھے۔ اس لیے ان کے سفر ناموں میں ہمیں شہروں، دیہاتوں کی خدمات لائق تحسین رہیں۔

جمیل الدین عالی ایک کالم نویسی، خاکہ ساز اور شاعری میں اپنی شناخت قائم کر چکے تھے۔ عالی نے سفر ناموں کو نہ ہی تاریخی دستاویز سے زیادہ اور نہ ہی اس میں سیاسی پروپیگنڈوں کو شامل کیا ہے۔ ان کے سفر نامے قلی و تاثرات و کیفیات ملتی ہیں۔ جمیل الدین عالی نے ۱۹۶۶ء میں یونیسکو فیلوشپ پروگرام کے تحت عالمی سیاحت کی۔ وہ ایران، عراق، لبنان، مصر، دہلی، روس، فرانس، برطانیہ، اٹلی، جرمنی، ہالینڈ، سوئٹزرلینڈ اور امریکہ جیسے ممالک دورے کیے۔ ان کے سفر ناموں کی روداد کالموں کی صورت میں روزنامہ جنگ میں شائع ہوتے رہے۔ اس طرح ان کے یہ دونوں سفر نامے "دنیا مرے آگے اور تماشا مرے آگے" کے عنوان سے 1965ء میں شائع کیے گئے۔ ان کے یہ سفر نامے تاریخی اور ادبی ہیں۔ ان کے سفر ناموں میں بھی سیاحتی ممالک کے سیاسی اور سماجی حالات کا پاکستان کے ساتھ تقابل ملتا ہے۔ سماجی طنز کے حوالے سے جمیل الدین کے سفر ناموں کو دیکھیں تو انھوں نے سماج کی ناہمواریوں کو طنز کا نشانہ بنانے میں ان کا اپنا ایک انداز ہے۔ وہ اپنی تلخ بیانی کو شکر کی دبیز تہہ میں لپیٹے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ وہ حقائق اور سچے کھرے انداز میں بیان کر دیتے ہیں ان کے سفر ناموں میں طنز کی دو صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ پہلی صورت میں طنز کی لہر سفر نامے کے پر کیف اور لذت انگیز بیانیہ میں کونین کی گولیوں کی طرح نمایاں ہوتی ہیں جو پُر تکلف اندازِ بیان میں قاری کے جسم و جاں میں اتر جاتی ہیں ان کی طنز کی اس قسم کو طنز لطیف کہا جاتا ہے۔ طنز کی یہ قسم ان کے تمام سفر ناموں میں ملتی ہے۔ جہاں اپنی ذات اور طنز معاشرے کے کرداروں کو طنز پر طنز کے تیر چلاتے ہیں اس میں طیقہ کو اشرافیہ کہتے ہیں۔ ان کی طنز کی یہ قسم زیادہ واضح اور بلاواسطہ ہے اس میں ذہلرنا کی عناصر شامل ہیں۔ ان کے سفر ناموں میں شخصی مزاج میں لطیفہ گوئی، زندہ تاریخی، دلی، جملے بازی اور نرگسی مزاح بھی ملتا ہے ان کے سفر ناموں کو بنیادی موضوع تاریخی شعور اخلاقی اقدار اور کا زوال اور سیاسی و سماجی تبدیلیاں بھی جمیل الدین کے سفر ناموں کا موضوع رہا ہے۔

جمیل الدین سفر ناموں میں سماجی طنز کا موازنہ عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں سے کرتے ہیں تو ان کے افتراکات اور اشتراکات ملتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی اور جمیل الدین عالی جو پہلو سب سے مشترک ملتا ہے وہ ان کے ہاں طنز میں مزاح کا پہلو ہے۔ دونوں لطیف انداز میں سماج ہونے والی برائیوں کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ جمیل الدین سے اپنی پہچان کو برقرار رکھنے کے لیے زبان پر بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ اس لیے ہم اپنی زبان سے غافل نہیں ہونا چاہیے جبکہ عطاء الحق قاسمی کے ہاں اس پہلو کے حوالے سے بات کریں تو ان کے سفر ناموں میں ہمیں انگریزی اور اردو کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ جمیل الدین عالی کے ہاں ہمیں ماضی کی روایات اور اقدار کو باآسانی کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں جبکہ عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں ہمیں سماجوں میں پائی جانے والی رسومات میں دوغلے پن کو طنز پر انداز میں بیان کرتے ہیں۔ مغرب میں جنس نگاری کے بڑھتے ہوئے رجحان پر گہرا طنز دونوں کے ہاں موجود ہیں۔ مجموعی طور پر دونوں سفر نامہ نگاروں کے ہاں ہمیں ناہمواریوں کے سماجی طنز کی مثالیں ملتی ہیں۔ اس تمام بحث کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ عطاء الحق قاسمی کے ہاں سماجی طنز مستنصر حسین تارڑ اور جمیل الدین عالی کی نسبت زیادہ ملتا ہے۔

ب: نتائج

1۔ عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں سماجی طنز کے نئے زاویے شکار کیے ہیں۔ سماج میں سیاست، معیشت اور اخلاقیات کے حوالے سے ان کے ہاں طنز کی کاٹ بہت زیادہ دکھائی دیتی ہے۔

2۔ عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں منفی رویوں اور ناہمواریوں پر طنز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہاں ان کے سفر ناموں میں مشرقی اور مغربی سماج کا تقابل بھی ساتھ ساتھ ملتا ہے۔

3۔ عطاء الحق قاسمی طنز کے تمام طریقوں کو اپنے سفر ناموں میں داخلی اور خارجی دونوں سطح پر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ج: سفارشات

۱۔ عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں کے علاوہ ان کے دیگر ادبی جہات کا جائزہ لیا جانا چاہیے۔ ان کی شاعری اور ان کے ڈراموں میں موجود طنز و مزاح کا ان کے سفر ناموں کے ساتھ تقابل کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں جنس نگاری پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

۳۔ مذکورہ مقالے کو پیش نظر رکھتے ہوئے سفر ناموں میں تقابل کی روایت کو بڑھایا جا سکتا ہے۔

۴۔ عطاء الحق قاسمی ایک ذود نویس ادیب ہیں لہٰذا ان کے کالموں، شاعری کے علاوہ ان کی ادبی خدمات کو مختلف سطحوں پر دیکھا جانا ضروری ہے۔

۵۔ عطاء الحق قاسمی کی نثر نگاری کے تجزیاتی مطالعے پر بھی کام کو پرکھا جا سکتا ہے۔

کتابیات

بنیادی مآخذ

- عطاء الحق قاسمی، شوق آوارگی، لاہور، دعا پبلیکیشنز، ۲۰۰۳ء
- ایضاً، دنیا خوبصورت ہے، لاہور، دعا پبلیکیشنز، ۲۰۰۰ء
- ایضاً، گوروں کے دیس میں، لاہور، گورا پبلیکیشنز، ۱۹۹۶ء
- ایضاً، دلی دور است، لاہور، جہانگیر بک ڈپو، ۱۹۹۵ء
- عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، اشاعت دوم، ۲۰۱۵ء

ثانوی مآخذ

- اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، اردو نثر میں طنز و مزاح، اکادمی ادبیات، لاہور، ۲۰۰۲ء
- اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، عطاء الحق قاسمی، شخصیت و فن، اکادمی ادبیات، لاہور، ۲۰۰۲ء
- انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفر نامہ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۷ء
- جمیل جالبی، ڈاکٹر، نئی تنقید، مرتبہ خاور جمیل، رائل بک کمپنی، کراچی، ۱۹۸۵ء
- حامد بیگ مرزا، ڈاکٹر، اردو سفر نامہ کی مختصر تاریخ، یمانی پرنٹرز، لاہور، ۱۹۹۹ء
- خالد محمود، ڈاکٹر، اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ، نئی دہلی، دریا گنج، لاہور، ۱۹۹۵ء
- ذوالفقار علی احسن، اردو سفر نامے میں جنس نگاری کا رجحان، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۸ء
- سکندر حیات مکین، عطاء الحق قاسمی، شگفتہ مسافر، ظفر اللہ چوک، سرگودھا، ۲۰۱۲ء

- فوزیہ چودھری، ڈاکٹر، شاداب موسموں کی آواز، نستعلیق مطبوعات، لاہور، ۲۰۰۹ء
- فوزیہ چودھری، ڈاکٹر، نقدِ ظرافت، پولیمر پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء
- قدسیہ قریشی، ڈاکٹر، اردو سفر نامے، انیسویں صدی میں، نئی دہلی، مکتبہ، جامعہ لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۸۷ء
- محمد خاور نوازش، عطاء الحق قاسمی کی تحریریں سیاسی و سماجی تناظر میں بہاؤالدین زکریہ یونیورسٹی، ملتان ۲۰۱۳ء
- محمد افضال بٹ، ڈاکٹر، اردو ناول میں سماجی شعور (طبع اول) یورپ اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء
- محمد حسن، پروفیسر، ادبی سماجیات، مشمولہ عصری ادب، جولائی تا اکتوبر، دہلی، لاہور، ۱۹۸۳ء
- نذیر تبسم، ڈاکٹر، پنجاب سندھ اور سرحد کی غزل کا موضوعاتی تقابل (قیام پاکستان کے بعد)، مشمولہ دریافت، اسلام شمارہ ۸

غیر مطبوعہ مقالہ جات

- فرحت وثیر، عطاء الحق قاسمی، ۱۹۹۰ء سے ۲۰۰۴ء تک کے سفر ناموں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے ایم فل پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۴ء۔۲۰۰۳ء
- منظور الہیٰ ممتاز، اردو سفر نامے تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے پی۔ ایچ ڈی اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۶ء
- نگینہ جبیں، اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ، ۱۹۴۷ء اس کے بعد، ۴۰۵ اے دریا آباد، آلہ آباد، دسمبر ۲۰۰۲ء

رسائل وجرائد

- الزبیر، سفر نامہ نمبر، جلد نمبر ۳۶۔۳۷، شمارہ نمبر ۳، ۴، ۱، اردو اکادمی، بہاولپور، ۱۹۹۸ء
- بازیافت، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، شمارہ نمبر ۹، جولائی ۲۰۰۶ء تا دسمبر ۲۰۰۶ء
- سیاہ ڈائجسٹ، لاہور، جلد 81، شمارہ 5، 4 جون 1999ء
- معاصر انٹرنیشنل، جلد نمبر ۳۔۴، لاہور، شمارہ نمبر، اکتوبر ۲۰۰۳ء تا مارچ ۲۰۰۴ء
- ماہنامہ اوراق، لاہور، شمارہ 5، 1978ء
- نوائے وقت، لاہور، جلد 7، شمارہ 3، 7 اپریل، 2008ء

لغات

- مولوی، فیروزالدین، فیروز اللغات، اردو جامع، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۲۷ء
- شان الحق حقی، مئولف، فرہنگ تلفظ، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء
- Webster's New illustration dictionary Allama's Frederiek Kullen Reinst, Books, Ink Publishers New York Washington D.C, 1970